ماحصل

کلیات

اقبال عظیم

Cont by the

ماحصل

پروفیسر سیّد اقبال عظیم
کا مکمّل سرمایۂ شاعری

مع

خودنوشت سوانح حیات

شائع کردہ

بزمِ خدام الادبؒ
ذاکر نگر اوکھلا، نئی دہلی

شاعر ——— پروفیسر سید اقبال عظیم
نام کتاب ——— ماحصل
ناشر ——— بزمِ خدام الادب۔ ذاکر نگر۔ اوکھلا نئی دہلی۔
تعدادِ کتب ——— ایک ہزار
قیمت (علاوہ اخراجاتِ ترسیل) پچھتر روپے

مطبع لاہوتی فائن آرٹ پریس
۱۷۱۱، سوئیوالان نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

ڈسٹری بیوٹر
ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس
۳۱۰۸ گلی عزیزالدین وکیل، کوچہ پنڈت لال کنواں دہلی ۶

نذر

ایک صاحب طرز سخن ور کی حیثیت سے اور ایک مستند معلم زبان و ادب کی حیثیت سے بر صغیر میں پروفیسر سید اقبال عظیم کی تعلیمی، ادبی اور علمی خدمات اب نصف صدی کو محیط ہیں۔ یہی سبب ہے کہ اُن کے تلامذہ اور قدر دان حضرات اور خواتین نہ صرف بر صغیر کے گوشے گوشے میں بلکہ دُور دراز ممالک تک پھیلے ہوئے ہیں۔ جہاں اُن کے شعری مجموعے بڑی قدر و منزلت سے پڑھے جاتے ہیں اور انھیں کی آواز میں ان کی غزلوں کے کیسٹ بیش قیمت تحفے سمجھ کر حاصل کئے جاتے ہیں۔ سابق مشرقی پاکستان میں ان کی خدمات کا اعتراف اس طرح کیا گیا کہ وہاں اُن کی نثری تصنیفات شائع ہو رہی ہیں جن میں سب سے اہم وہاں کا دو سالہ لسانی اور ادبی جائزہ ہے جو مشرقی بنگال میں اردو کے نام سے شائع ہوا اور پاکستان میں انھیں اس طرح خراجِ تحسین ادا کیا گیا کہ وہاں یکے بعد دیگرے کئی شعری مجموعے شائع کئے جا چکے ہیں۔ اس لئے ادارہ بزم خدام الادب۔ ذاکر نگر، اوکھلائی دہلی نے بھی اپنا فرض سمجھا کہ ہندوستان میں بھی جہاں اُن کی نصف زندگی گزری ہے ان کی خدمات کا ٹھوس اعتراف کیا جانا چاہیے۔ چنانچہ ان کی کلیات مرتب کرنے کا اہتمام کیا گیا جو "ماحصل" کے نام سے اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ ہم اپنی اس ناچیز کاوش کی پانچ سو جلدیں تحفتاً بڑے فخر کے ساتھ پروفیسر صاحب موصوف کی خدمت میں پیش کرتے ہیں اور اس کتاب کے جملہ حقوق ان کی صاحبزادی محترمہ فردوس اقبال کے نام محفوظ کرتے ہیں

(معتمد اعزازی)

۸ر جولائی سنہ ۱۹۸۷ء

بزم خدام الادب ذاکر نگر اوکھلا نئی دہلی

شاملاتِ کتاب

تعارفِ شاعر

پیدائش : ۸ جولائی ۱۹۱۳ء، میرٹھ، یو، پی، ہندوستان

وطنیت : آبائی وطن قصبہ انبھٹہ، ضلع سہارنپور لیکن تعلیم و تربیت لکھنؤ میں ہوئی۔ اس لئے لکھنؤ ہی سے وطنی وابستگی ہے۔

روایات : ۱۔ دادا صاحب قبلہ سیّد فضل عظیم فضل، اُردو اور فارسی کے نعت گو شاعر۔

۲۔ نانا صاحب قبلہ حضرت ادیب میرٹھی تلمیذ بیان و یزدانی میرٹھی۔ صاحبِ دیوان غزل گو شاعر

۳۔ والدِ محترم سیّد مقبول عظیم عرش، اُردو کے غزل گو شاعر

۴۔ برادر بزرگ سیّد وقار عظیم مرحوم، برِصغیر کے بلند مرتبہ تنقید نگار اور ماہرِ تعلیم۔ درجنوں تصانیف یادگار

تعلیم : ۱۔ بی۔ اے، لکھنؤ یونیورسٹی ۱۹۳۴ء

۲۔ ایم۔ اے، اُردو، فرسٹ کلاس فرسٹ، آگرہ یونیورسٹی ۱۹۴۳ء

۳۔ ریسیرچ اسکالر ڈھاکہ یونیورسٹی ۵۲-۱۹۵۱ء۔ نامکمل تحقیقی مقالہ شائع ہو چکا ہے۔

۴۔ سندِ معلمی، ٹیچرس ٹریننگ کالج لکھنؤ ۱۹۳۵ء۔

۵۔ ہندی اور بنگلا کے اعلیٰ معیار امتحانات ۴۱ء۔ ۶۵ء، لکھنؤ، ڈھاکہ

ملازمت : ۱۔ معلّم انگریزی و اُردو، گورنمنٹ جوبلی کالج، لکھنؤ اور دیگر گورنمنٹ تعلیمی ادارے ۱۹۳۹ء تا جولائی ۱۹۵۰ء

۲۔ لیکچرار اُردو، گورنمنٹ ڈگری کالج ڈھاکہ اگست ۵۰ء تا ستمبر ۵۱ء

۳۔ پروفیسر اور صدر شعبۂ اُردو (سینیر ایجوکیشن سروس، حکومت مشرقی پاکستان) ۱۹۵۱ء تا ۱۹۷۰ء

۴۔ سینیر ریسرچ آفیسر، سکریٹریٹ حکومت مشرقی پاکستان (عاریتاً) ۱۹۶۵ء ۔ ۱۹۷۰ء

(On Deputation.)

تصانیف : ۱۔ مشرقی بنگال میں اُردو، دو سَو سالہ لسانی و ادبی تذکرہ ۱۹۵۴ء

۲۔ مضراب، پہلا مجموعۂ غزلیات ۱۹۷۵ء

۳۔ قابِ قوسین۔ مجموعۂ نعتیہ کلام ۱۹۷۷ء

۴۔ مضراب و رباب۔ غزلوں کا دوسرا مجموعہ ۱۹۸۱ء

۵۔ دیوانِ ناطق۔ حکیم ناطق لکھنوی کے دیوان کی ترتیب، تدوین اور اشاعت مع مقدمہ، ۱۹۵۶ء

۶۔ سات ستارے : سات معمارانِ پاکستان کے سوانح

۷۔ لب کشا۔ نعتوں اور غزلوں کا مجموعہ

۸۔ مشرق : مشرقی پاکستان سے متعلق ادبی، لسانی،
معاشرتی اور ثقافتی مضامین

۹۔ انگریزی زبان میں انیس ۱۹ اضلاع مشرقی پاکستان
سے متعلق ادبی اور لسانی، تحقیقی مقالات، ۱۹۶۵ء۔ ۱۹۷۰ء

۱۰۔ درجنوں نصابی کتابیں جو درجۂ سوم تا بی۔ اے
شاملِ نصاب رہیں

زیرِ ترتیب کتابیں:

۱۔ آنکھوں دیکھی۔ شخصیات اور واقعات جنہوں نے مجھے
متاثر کیا۔

۲۔ روحِ سخن۔ جدید و قدیم شعراء کے غیر معروف اور
منتخب اشعار۔

۳۔ رہنمائے تلفظ

موجودہ پتہ:

۲-۴۰/ڈی، بلاک ۶ پی-ای-سی-ایچ-ایس
کراچی ۲۹

فون: ۴۳۷۰۵۵

من آنم

(پیش لفظ دیوانِ اوّل)

آج سے چار سال قبل میں کراچی میں ایک اجنبی مسافر تھا لیکن اب ایسا نہیں ہے، اس لئے کہ اس دوران میں مدّت کے بچھڑے ہوئے بھائی بہنوں کا قرب حاصل ہوا، ہندوستان کے پرانے ساتھیوں اور ہم جماعتوں سے ملاقاتیں رہیں، مشرقی پاکستان کے ان خانہ بدوش دوستوں سے دوبارہ ملنا جلنا ہوا جن سے ملنے کی اب کوئی امید نہ تھی اور خوش قسمتی سے کچھ نئے مخلص احباب بھی میسّر آ گئے۔

اس کے علاوہ مقامی مشاعروں اور نشستوں میں نہ صرف کراچی کے بلکہ دوسرے شہروں کے شعراء سے بھی شرفِ نیاز حاصل ہوا۔ اس طرح میری اجنبیت تو بے شک بڑی حد تک دور ہو گئی لیکن میری غزلوں کا معاملہ اس سے مختلف ہے، اس لئے کہ چند غزلوں کے علاوہ جو میں یہاں پیش کرتا رہا ہوں میری تمام غزلیں ہنوز محتاجِ تعارف ہیں۔ ایسی صورت میں اس کتاب کی اشاعت کو میں غنیمت جانتا ہوں کہ اس کے توسط سے یہاں کے ادبی حلقوں میں میرا مزید تعارف ممکن ہو سکے گا جو اس لئے بھی ضروری ہے کہ معذوریِ چشم کے سبب میں سچ مچ "نظر بند"

ہوں اور کہیں آنے جانے کے معاملے میں دوسروں کا محتاج۔

جہاں تک رسمی تعارف کا سوال ہے، میں گزارش کروں گا کہ اس کتاب میں کہیں میری ایک تصویر بھی ہے۔ اگر اس سے پہلے مجھے آپ نے کبھی نہ دیکھا ہو تو ایک نظر اس تصویر پر ڈال لیجیے اور ابتدائی چند غزلیں ذرا توجہ سے ملاحظہ فرما لیجیے۔ بس میرا مزاج سمجھنے کے لئے اور اس کتاب کے مطالعے کے لئے اس قدر تعارف کافی ہوگا۔ اس کے بعد بھی اگر آپ کو اصرار ہے کہ مجھے مزید سامانِ رسوائی فراہم کرنا چاہیے تو عرض کیے دیتا ہوں کہ اقبال عظیم میرا نام، ۸۔ جولائی ۱۹۱۳ء تاریخِ پیدائش، میرٹھ جائے پیدائش اور قصبہ انبہٹہ ضلع سہارن پور میرا آبائی وطن ہے جسے میں نے عالمِ ہوش میں پہلی اور آخری بار والدین کے انتقال کے بعد تیس سال کی عمر میں دیکھا۔ اگر شادی کفو میں نہ ہوئی ہوتی تو شاید میں اس سعادت سے بھی ہمیشہ کے لئے محروم رہ جاتا۔

وطن سے اس دوری کا سبب یہ ہے کہ بہ سلسلۂ ملازمت، والد صاحب قبلہ ہمیشہ پردیس میں رہے، اس لئے ہم سب بھائی بہنوں کی پیدائش اور پرورش غریب الوطنی کے عالم میں ہوئی اور یہ غریب الوطنی کچھ اس طرح میرا مقدر بن گئی کہ ابتدا سے آج تک دم قدم کے ساتھ ہے۔ چنانچہ میرٹھ میں پیدائش کے بعد طفلی کا زمانہ

الہ آباد میں گزرا۔ تعلیم کی ابتدا کانپور میں ہوئی، ہائی اسکول کا امتحان اُناؤ سے پاس کیا، انٹرمیڈیٹ، بی۔ اے اور معلمی کی تعلیم لکھنؤ میں حاصل کی، اردو میں ایم۔ اے کا امتحان آگرہ یونیورسٹی سے پاس کیا، ہندی کا امتحان سلطان پور سے اور بنگلہ کا امتحان چاٹگام سے جب کہ تحقیقی کام کے لئے ڈھاکہ یونیورسٹی سے مُنسلک رہا۔ ملازمت اور اس سے متعلق فرائض کے سلسلے میں لکھنؤ کے علاوہ ہمیر پور، مہوبہ، باندہ، کانپور، بارہ بنکی، سلطان پور، الہ آباد، فیض آباد، گورکھپور اور بنارس وغیرہ کی سیر کی۔ مشاعروں کے توسط سے کلکتہ سے لے کر ریاست رام پور تک قریب قریب تمام قابلِ ذکر شہروں کی ہوا کھائی۔ مشرقی پاکستان میں ڈھاکہ، چاٹگام، راج شاہی، کُھلنا، سلہٹ وغیرہ میں زندگی بسر ہوئی۔ پنشن کے بعد لاہور آیا جہاں سے سیالکوٹ، پنڈی، پشاور، مری، ٹیکسلا، واہ اور تربیلا کی سیاحت ہوئی اور اب کراچی میں ہوں۔ پیچھے مُڑ کر دیکھتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے کہ یا تو کبھی بارہ بنکی سے لکھنؤ تک کا سفر بھی دل پر گراں گزرتا تھا یا ہوا یہ کہ قریب قریب پورے برِصغیر کا احاطہ کر چکا ہوں اور اب بھی یقین نہیں کہ سفرِ آخرت کا آغاز کہاں سے ہوگا۔

تاہم آبائی وطن سے بےتعلقی اور غریب الوطنی کی اس داستان کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ میرے ذہن میں سرے سے وطن کا کوئی واضح تصوّر ہی موجود نہیں۔ حقیقتِ حال اس کے برعکس یہ ہے کہ میری زندگی کا وہ حصّہ

اودھ کی گلیوں میں بسر ہوا جس میں انسانی شعور اپنی راہیں متعین کرتا ہے
اور احساسات و جذبات، تہذیب و تشکیل کی منزلوں سے گزرتے ہیں۔
یہی سبب ہے کہ سرزمین لکھنؤ کے ایک ایک چپے سے مجھے وہی والہانہ
تعلقِ خاطر ہے جو کسی کو اپنے وطنِ عزیز سے ہونا چاہیے بلکہ میرے قلب
و دماغ اور ذہن و ضمیر کو ان خوشگوار فضاؤں میں جو کچھ میسر آیا وہی میری
زندگی کی اساس اور شخصیت کی بنیاد ہے۔

لکھنؤ چھوڑے ایک زمانہ گزر چکا اور پچھلے پچیس برسوں میں کیسے
کیسے حسین منظر اور رنگ و بُو میں ڈوبے ہوئے کیسے کیسے خوبصورت شہر
میں نے اِنہیں آنکھوں سے دیکھے ہیں جو اب بے نُور ہیں، لیکن لکھنؤ کی
زندگی کا ایک ایک لمحہ اُن سب پر حاوی ہے اور بقول ریاض!

ع "وہ گلیاں یاد آتی ہیں جوانی جن میں کھوئی ہے"

آج سے پچیس برس پہلے میری زندگی میں جو کچھ گزرا، ایسا معلوم
ہوتا ہے کہ وہ سب کچھ کل کی بات ہے۔ یونیورسٹی کا سنجیدہ ماحول، دریائے
گومتی کا خنک اور شاداب کنارا، حضرت گنج کی نگاہوں کو اُچک لینے
والی چمک دمک، امین آباد کی چہل پہل، اکبری دروازے سے گول
دروازے تک پھیلی ہوئی نظر لگ جانے والی اور گنگناتی ہوئی زندگی،
خوشبو سے لدی ہوئی سکندر باغ کی شامیں، چاندنی میں ڈوبی ہوئی

چار باغ کی صاف ستھری فضا، نوابانِ اودھ کا قصرِ شاہی، شاہِ نجف، چھتر منزل، پکچر گیلری، شیش محل، وکٹوریہ پارک، بنارسی باغ، بٹلر پارک، بارہ دری اور اللہ جانے کیا کیا، پوری تازگی کے ساتھ نظروں کے سامنے ہے۔

عالمِ تصور میں کبھی کبھی یوں محسوس ہوتا ہے کہ کتابیں بغل میں دبائے امیرالدولہ لائبریری کی سیڑھیوں سے نیچے اتر رہا ہوں، گنگا پرشاد لائبریری میں بیٹھا کسی تازہ رسالے کا مطالعہ کر رہا ہوں، رفاہِ عام یا بارہ دری کے کسی مشاعرے میں شریک ہوں، کسی پارک میں مولانا شبیر احمد عثمانیؒ یا مولانا ابوالکلام آزاد کی تقریر سن رہا ہوں، یونیورسٹی کے جلسۂ تقسیمِ اسناد میں رابندر ناتھ ٹیگور کے خوبصورت خطبۂ صدارت کا ایک ایک لفظ ذہن میں محفوظ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں، آئی۔ ٹی گرلز کالج کے مشاعرے میں ترنم سے غزل پڑھ رہا ہوں، اِرَم لکھنوی مرحوم کے ساتھ حضرت آرزوؔ کی خدمت میں حاضر ہوں، حضرت نیاز فتحپوری، حضرت اثرؔ، حضرت صفیؔ، حضرت قدیرؔ یا حضرت آسی الدنی کے دولت کدے پر اُن سے شرفِ نیاز حاصل کر رہا ہوں۔ مئی اور جون کی جھلسا دینے والی دھوپ میں نخاس کے کسی کباڑ خانے سے اردو کے قدیم نسخے یا انگریزی کے پرانے شاہکار کرید کرید کر نکال رہا ہوں۔ پرنس، پلازہ یا الفنسٹن میں بیٹھا کوئی انگریزی فلم دیکھ رہا ہوں، میوزک کالج میں وائلن کا درس لے رہا ہوں، لال باغ کے کسی سرکس یا کارنیوال سے لطف اندوز ہو رہا

ہوں، یا امین آباد پارک میں رجبی شریف کے شان دار جشن سے روحانی فیض حاصل کر رہا ہوں۔

غرض کس کس بات کا ذکر زبان پر لاؤں اور اپنے پہلو سے کون کون سے نشتر نکال کر آپ کے سامنے رکھ دوں۔ بے حد اختصار کے ساتھ جو کچھ میں نے عرض کیا ہے اُس کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ میری فکر و نظر نے ابتداً جس گرد و پیش میں تربیت پائی اُس کا کچھ نہ کچھ اندازہ آپ کو ہو جائے، لیکن میری مجبوری یہ ہے کہ اپنے وہ زخم آپ کو نہیں دکھا سکتا جو انہیں گلی کوچوں میں میں نے درپردہ اور دیدہ و دانستہ کھائے، اس لئے کہ وہ زخم ماضی کی مقدس امانتیں ہیں جن کی نمائش جرم ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اِن زخموں کی خوشبو میری غزلوں میں کہیں کہیں آپ کو خود محسوس ہو جائے، خاص طور پر ابتدائی دَور کی غزلوں میں۔

ماضی بعید کا یہ احوال تشنہ رہ جائے گا اگر میں یہ بھی نہ عرض کرتا چلوں کہ ۱۹۳۵ عیسوی میں ایک ماہ کے اندر یکے بعد دیگرے والد صاحب اور والدہ صاحبہ کے انتقال کے بعد سے ۱۹۳۹ء تک، جب میری مستقل ملازمت شروع ہوئی چار برس کا زمانہ میرے لئے انتہائی آزمائش کا زمانہ تھا۔ اس زمانے میں بھائی صاحب الہ آباد یونیورسٹی میں ریسرچ کر رہے تھے، نہ میں ملازم نہ وہ ملازم، سات آٹھ بھائی بہنوں کی پرورش کی ذمہ داری اور

لکھنؤ کی زندگی کی کشتی کس طرح کنارے لگی، نہ اس کی تفصیل کے لئے میرے پاس الفاظ ہیں اور نہ وہ تفصیل سُن کر آپ خوش ہوں گے۔ اس لئے صرف اتنا اشارہ کافی ہے کہ مختصر سا یہ دور میرا سب سے بڑا مُعلّم ثابت ہوا۔ پہلے پہل زندگی سے دو بدو ٹکر لینا پڑی۔ اسی دَور نے میرے مزاج کو وہ پندار اور ارادوں کو وہ پختگی عطا کی جس نے بعد کی زندگی میں ہر قدم پر مجھے سہارا دیا۔

بعد کی زندگی سے میری مراد ۱۹۵۰ء کے بعد کی زندگی ہے جس کا تعلق مشرقی پاکستان سے ہے۔ بیس برسوں پر پھیلی ہوئی اس زندگی کا احوال اگر لکھنے بیٹھوں گا تو دفتر کے دفتر سیاہ ہو جائیں گے، اس لئے اس طویل داستان کے صرف جلی عنوانات کی طرف اشارہ کرنا کافی سمجھتا ہوں۔ ان عنوانات میں ترکِ وطن کا کرب، خانہ بدوشی کی تلخیاں، غریب الوطنی کی صعوبتیں، از سرِ نو زندگی کا آغاز، نئے ہم وطنوں کا سلوک، اہلیہ کا انتقال، تین چھوٹے چھوٹے بچوں کی تنِ تنہا پرورش کی نازک ذمہ داری، بینائی کا زیاں، اس زیاں کے بعد ملازمت کی پیچیدگیاں، لسانی اور صوبائی عصبیت، مہاجر کُشی، سیاسی انتشار، قبل از وقت پنشن، دوسری مہاجرت، تیسری وطنیت، چند عزیزوں اور پُرانے دوستوں کی نوازشیں شامل ہیں۔

مجھے اعتراف ہے کہ میرے شعر نے ان تمام باتوں کا اثر قبول کیا، لہٰذا

اُن کا سرسری ذکر ضروری تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان تمام تجربات کے دیئے ہوئے زخم تکلیف دہ ہونے کے باوجود مجھے عزیز ہیں، اس لئے کہ انہیں سے میں نے زندہ رہنے کا سلیقہ اور میرے شعر نے اظہار کی جرأت پائی۔

تعلیم: شاید اس سے پہلے بتا چکا ہوں کہ میں نے اردو میں ایم۔اے۔ کیا ہے۔ اب اتنا اضافہ اور کیے دیتا ہوں کہ یہ امتحان میں نے ملازمت کے زمانے میں بی۔اے پاس کرنے کے نو سال بعد یعنی ۱۹۴۳ء میں پرائیویٹ اُمیدوار کی حیثیت سے فرسٹ ڈویژن میں فرسٹ پوزیشن کے ساتھ آگرہ یونیورسٹی سے پاس کیا۔ اس امتحان سے کئی یادیں وابستہ ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ مُحبّی ڈاکٹر شوکت سبزواری مرحوم اور جناب مخمور اکبرآبادی میرے ساتھ اس امتحان میں شریک تھے اور مولانا حامد حسن قادری، سید مسعود حسن ادیبؔ، سید احتشام حسین اور جناب آلِ احمد سرورؔ ہمارے ممتحنوں میں شامل تھے۔

۱۹۵۱ء میں ڈاکٹر عندلیب شادانی مرحوم کے مشورے پر میں نے ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے ڈھاکہ یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ تحقیقی مقالہ دو سال کے اندر مکمل کرنا تھا لیکن ضابطے کے مطابق ڈھاکہ میں کم سے کم ایک سال کا قیام ضروری تھا۔ جب ایک سال پورا ہونے میں صرف ایک مہینے کی کسر باقی تھی کہ ڈھاکہ سے میرا تبادلہ ہو گیا اور کام جاری رکھنے کی اجازت نہیں ملی۔ ہندوستان میں ہندی کا اور بنگال میں بنگلہ کا اعلیٰ معیار کا امتحان پاس کیا۔ ہندی میں

عبدالرحیم خانِ خاناں، میرا بائی اور رَس کھان کا مطالعہ میں نے خصوصیت کے ساتھ کیا ہے اور بنگلہ میں اتنی استعداد پیدا کر لی تھی کہ چھوٹی موٹی تقریریں کر سکتا تھا اور کتابیں پڑھ سکتا تھا۔ بعض بنگلہ افسانوں اور نظموں کے ترجمے بھی میں نے کیے ہیں۔ فارسی اور عربی کے امتحانات میں نے الگ الگ پاس نہیں کیے۔ سوائے اِس کے کہ گھر کی تعلیم کے علاوہ فارسی کا ایک ایک پرچہ بی اے اور ایم۔ اے کے امتحانی نصاب میں شامل تھا اور انٹرمیڈیٹ تک عربی میرے مضامین میں۔ فارسی شاعری سے مجھے بے شک عشق ہے خاص طور پر نعتیہ کلام اور مولانا رومؔ سے۔

تلمّذ و استفادہ: میں نے کبھی کسی کے آگے باقاعدہ زانوئے ادب تہ نہیں کیا لیکن میرے نزدیک یہ فخر کی بات نہیں، کم نصیبی کی بات ہے۔ ابتدا میں میں نے اپنی دو دو غزلیں حضرت آرزوؔ لکھنوی، حضرت صفیؔ لکھنوی اور حضرت جعفر علی خاں اثرؔ کی خدمت میں پیش کی تھیں اور ارادہ تھا کہ اِن بزرگوں میں سے جس کی طبیعت کو اپنے مزاج کے مطابق پاؤں گا اُسی کا ہو رہوں گا، لیکن کسی فیصلے تک پہونچنے سے پہلے ہی مجھے مستقل ملازمت کا پروانہ مل گیا اور لکھنؤ چھوٹ گیا۔ اِس طرح یہ بات جہاں سے شروع ہوئی تھی وہیں ختم بھی ہو گئی اور میں بے اُستادہ رہ گیا، لیکن اس مختصر استفادے سے مجھے یہ نفع ضرور پہنچا کہ ان بزرگوں کی ہمت افزائی نے مجھے خود اعتمادی عطا کی

اور شعر کہنے کا حوصلہ بخشا۔

مجھ سے بجا طور پر پوچھا جا سکتا ہے کہ ایسی صورت میں میں نے کن کن اساتذۂ سخن کے مطالعے سے استفادہ کیا لیکن یہ سوال پیچیدہ ہے اور اس کا جواب مشکل، اس لئے کہ ساری زندگی پڑھنے پڑھانے ہی میں صرف ہوئی اور ظاہر ہے کہ اس طویل مدت میں میرے ذہن نے محسوس اور غیر محسوس نہ معلوم کتنے تاثرات قبول کئے ہوں گے جن کی نشان دہی اب ممکن نہیں۔ ہاں اس بات کو سمیٹ کر بیان کرنے کی کوشش کی جائے تو یہ عرض کر سکتا ہوں کہ میرؔ و غالبؔ کے علاوہ جن کا احترام ہماری مقدس ادبی روایت ہے، غزل گو شعرا میں مومنؔ، مصحفیؔ، داغؔ، آرزوؔ اور حسرتؔ نے مجھے خصوصیت کے ساتھ متاثر کیا۔ انیسؔ کی میں بہت عزت کرتا ہوں۔ اکبرؔ الہ آبادی کو اُن کے فن میں دُرِ یتیم جانتا ہوں، جوشؔ، حفیظؔ، فراقؔ اور مجازؔ کی دل سے قدر کرتا ہوں۔ یگانہؔ چنگیزی کو اُن کے مزاج کے باوجود پسند کرنے پر مجبور ہوں اور اقبالؔ کو اُردو شاعری کی معراج سمجھتا ہوں۔ اگر مجھ سے کہا جائے کہ اِن میں سے صرف ایک کا انتخاب کر لو تو بلا تامل اقبالؔ کا دامن تھام لوں گا اس لئے کہ اقبال نے جو کچھ ہمیں دیا ہے ہمارے پورے سرمایۂ شاعری پر بھاری ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اقبالؔ ہمارے تمام سخنوروں کے سرتاج ہیں اور اُن کی شاعری مجموعی حیثیت سے ہماری شاعری کا حرفِ آخر۔ لیکن نا موں کہ یہ مختصر سی

فہرست پیش کرنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اس فہرست کے باہر سب کچھ میری نظروں میں ہیچ ہے۔ اس کے برعکس میرا عقیدہ یہ ہے کہ اچھا شعر کسی کی میراث نہیں۔ یہی سبب ہے کہ جہاں کہیں اچھا شعر سنتا ہوں اُس کا حق پہچانتا ہوں، شاعر قدامت پرست ہو یا ترقی پسند، کہنہ مشق ہو یا نوآموز۔ مثال کے طور پر جہاں احمد ندیمؔ قاسمی، مصطفےٰ زیدی اور ن۔م راشدؔ کے کلام میں مجھے اکثر شعر ایسے ملے ہیں جن پر رشک آیا ہے وہاں کچھ نوجوانوں کے شعر بھی مجھے زبانی یاد ہیں جو مزہ لے لے کر دوستوں کو سناتا ہوں۔ کسی شعر کو صرف اس لئے بُرا کہنا کہ شاعر کا تعلق کسی ایسے مکتبِ فکر سے ہے جسے ہم پسند نہیں کرتے یا کسی شعر کو صرف اس لئے اچھا کہنا کہ اُس کا تعلق کسی دیوپیکر شخصیت سے ہے، میرے نزدیک بڑی زیادتی کی بات ہے۔ میں چہرے نہیں دیکھتا شعر سُنتا ہوں۔

یہاں اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ زمانۂ طالب علمی میں مجھے مشاعروں سے عشق تھا۔ عجب نہیں کہ میرے ذوقِ شعری کی تشکیل پر یہ مشاعرے بھی اثر انداز ہوئے ہوں۔ جب وہ مشاعرے یاد آتے ہیں تو چالیس[۴۰] پینتالیس[۴۵] برس کی مدت گزر جانے کے باوجود ایک آواز فوراً میرے کانوں میں گونجنے لگتی ہے اور وہ آواز ہے، بزرگِ محترم سید آلِ رضا کی جن کا پہلا مجموعۂ غزلیات ''نوائے رضا'' کسی زمانے میں مجھے قریب قریب پورا حفظ تھا۔ آج انھیں کہیں شعر پڑھتے

سُنتا ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سیّد صاحب لکھنؤ کی کسی محفلِ سخن میں اپنی نازک مزاجی، جامہ زیبی، خوبصورت آواز، سنجیدہ ترنم، نرم و نازک شعر اور شہزادوں جیسی شخصیت کے ساتھ شمعِ محفل بنے سامنے تشریف فرما ہیں۔ ساری محفل کی نگاہیں اُن کی جانب ہیں اور اُن سے بار بار یہ مطلع پڑھوایا جا رہا ہے:

وفا خطا تھی، خطا ہم نے زندگی بھر کی
اب اس کے آگے جو مرضی ہو بندہ پرور کی

'نوائے رضا' سے 'غزلِ معلّیٰ' تک پہنچتے پہنچتے سیّد صاحب نے اپنی آنکھوں سے کیسے کیسے چراغ گُل ہوتے دیکھے ہیں اور اب اِن تمام چراغوں کی روشنی اپنے دامن میں سمیٹے، شکر ہے کہ ہمارے درمیان رونق افروز ہیں۔ سیّد صاحب لکھنؤ کے آخری مکتبِ فکر کی یادگار ہیں بلکہ اپنی ذات سے خود ایک پورا عہد ہیں۔

مشرقی پاکستان میں: میں نے مشرقی پاکستان میں اپنی زندگی کے بتیس سال اردو زبان کے ایک رضا کار کی حیثیت سے گزارے اور میری تمام علمی اور ادبی صلاحیتیں اُس صوبے میں صرف اردو زبان و ادب کے استحکام اور تبلیغ و اشاعت کی کوششوں میں صرف ہوئیں۔ چنانچہ وہاں بیٹھ کر میں نے لکھنے پڑھنے کا جو کچھ بھی کام کیا سب کا سب اسی مقصد کے تحت کیا۔

اس مجموعے کے علاوہ جو اِس وقت آپ کے سامنے ہے اور جس کا بیشتر حصہ مشرقی پاکستان میں تخلیق ہوا، میری ایک کتاب "مشرقی بنگال میں اُردو" ہے جو ۱۹۵۴ء میں چاٹگام سے شائع ہوئی۔ یہ فی الحقیقت میرا نامکمل تحقیقی مقالہ ہے جسے میں نے کتابی شکل دی ہے۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس کتاب میں مشرقی پاکستان میں اردو زبان و ادب کی دو صدیوں پر پھیلی ہوئی تاریخ پیش کی گئی ہے اور اس کتاب کا بیشتر مواد علمِ سینہ ہے جو دو برس کی دوڑ دھوپ کے بعد وہاں کے بزرگوں کے تعاون سے اور حکیم حبیب الرحمٰن مرحوم کی قلمی تصنیف "ثلاثہ غسالہ" کی مدد سے مرتب کیا گیا۔ حکیم ناطق لکھنوی مرحوم اس امید میں کلکتے سے چاٹگام تشریف لے گئے تھے کہ ایک اسلامی مُلک میں اُن کی قدر و قیمت پہچانی جائے گی اور اُن کا دیوان جو ایک مدت سے منتظرِ طباعت تھا شائع ہو سکے گا، لیکن ایسا نہیں ہوا اور حکیم صاحب چاٹگام ہی میں انتقال فرما گئے۔ مجھے اس بات کا علم ہوا۔ میں نے مسودہ حاصل کر کے اُسے مرتب کیا اور اُن کے صاحبزادے سید رشید احمد صاحب کے تعاون سے دیوانِ ناطق کے نام سے شائع کیا۔

میں نے "سات ستارے" کے نام سے ایک اور کتاب خاص طور پر بنگالیوں کے لئے لکھی جس میں پاکستان کے سات معماروں کی زندگی کے حالات بہت آسان زبان میں درج کیے گیے ہیں۔ اسی طرح مرکزی

حکومت کی فرمائش پر ڈاکٹر عندلیب شادانی مرحوم کی معیت میں ایک کتاب لکھی جس میں مشرقی پاکستان کی تاریخی، معاشرتی، تہذیبی، ثقافتی اور ادبی زندگی سے متعلق چھوٹے چھوٹے دلچسپ مضامین آسان زبان میں ہیں۔ ۱۹۶۴ء میں صوبائی سکریٹریٹ نے میری خدمت عاریتاً حاصل کی اور وہاں ایک ریسرچ افسر کی حیثیت سے میں نے اس صوبے کے اُنیس اضلاع سے متعلق اردو، فارسی اور عربی ادبیات پر انگریزی زبان میں ابواب لکھے۔ ڈھاکہ اور چاٹگام کی کتابیں میرے سامنے شائع ہو گئی تھیں باقی کا اللہ جانے کیا ہوا۔ ان ابواب میں بہت سا مواد ایسا تھا جو میری کتاب میں شامل نہیں، اس لئے اُس کے زیاں کا رنج ہے لیکن رنج کرنے سے بھی کیا حاصل کہ ذکر جس جگہ کا ہے اب وہاں نہ مشرقی پاکستان ہے اور نہ اُردو۔

اِس سلسلے میں کچھ کام میں نے اور بھی کیے مثلاً بنگلہ ترقیاتی بورڈ کی جانب سے ایک "بنگلہ اردو لغت" شائع کیا گیا جس کے حصۂ اردو کی تصحیح و ترتیب کا کام میرے سپرد تھا۔ پروفیسر سعد مُنیر مرحوم اور مولانا عبدالرحمن بیخود نے خاصی بڑی تعداد میں بنگلہ افسانوں کے ترجمے اردو میں کیے جو سرکاری سطح پر کتابی شکلوں میں شائع ہوئے۔ اِن کتابوں پر نظرِ ثانی اور اُن کی ترتیب کا کام بھی میرے فرائض میں شامل تھا۔ جناب سید محمد عباس اُس زمانے میں

وہاں کسٹم کلکٹر تھے اور ایک ادبی تذکرہ مُرتب فرما رہے تھے۔ اس کتاب پر نظرِ ثانی کا شرف مجھے حاصل ہوا۔ یہ کتاب بعد میں 'سفینۂ غزل' کے نام سے شائع ہوئی۔ ڈھاکہ سے اردو کا ایک معیاری ماہ نامہ "خاور" ڈاکٹر عندلیب شادانی مرحوم کی ادارت میں شائع ہوا۔ میں اس منصوبے کے محرکوں میں شامل تھا اور ڈاکٹر صاحب مرحوم کا شریکِ کار۔ ڈھاکہ سے بنگلہ زبان کا ماہ نامہ "دل رُبا" اور چاٹگام سے اِسی زبان کا ہفت روزہ رسالہ "زمانہ" شائع ہوتا تھا۔ دونوں مدیروں سے میرے تعلقات تھے۔ اُنھوں نے میری تحریک پر اِن جرائد کے اردو ایڈیشن شائع کیے جن کی ترتیب و تدوین کا کام بھی میں نے سنبھالا۔ ڈھاکہ کالج میگزین میں حصّۂ اُردو کا اضافہ کرایا اور چاٹگام کے میڈیکل کالجوں سے بھی میں نے اردو کے رسائل شائع کرائے۔ شروع سے آخر تک میں انجمن ترقی اردو کی مجلسِ انتظامیہ سے وابستہ رہا اور نائب صدر و صدر کی حیثیت سے حسبِ توفیق مجھ سے جو کچھ ہو سکا کرتا رہا۔ مشرقی پاکستان میں اردو کے مسائل نیز وہاں کی نئی اور پُرانی شخصیتوں اور وہاں کی ادبی سرگرمیوں سے متعلق میرے مضامین ادبِ لطیف' ماہِ نو' مہر نیم روز' نوزنگ' نگار (پاکستان) اور خاور وغیرہ میں شائع ہوتے رہے۔ میں نے بعض بنگلہ افسانوں اور نظموں کے ترجمے بھی کیے اور بنگالی ادیبوں کو اردو سے بنگلہ میں ترجموں پر آمادہ کیا۔ غرض وہاں کی زندگی کا ہر لمحہ اسی لگن اور دُھن

بڑا صدمہ ہوتا ہے کہ جس دیس میں قائدِ اعظمؒ کے اس ارشاد کے بعد کہ: "پاکستان کی زبان اُردو اور صرف اُردو ہوگی" گھر گھر بنگالی بچوں کو اردو کی تعلیم بڑے شوق و ذوق سے دی جاتی تھی، جہاں نمازِ جمعہ کے خطبے، نکاح اور میلاد میں اُردو زبان کا استعمال لازمی سمجھا جاتا تھا، جہاں اُردو کے اخباروں سے پُڑیاں بنانا گناہ تھا، جہاں پورے صوبے پر پھیلے ہوئے بے شمار مکتبوں اور مدرسوں میں ذریعۂ تعلیم اُردو تھی، جہاں گھروں اور بازاروں میں ریڈیو پر صرف اُردو کی غزلیں اور گانے سُنے جاتے تھے، جہاں ہر سینما ہاؤس میں صرف اردو کا فلم دکھایا جاتا تھا، جہاں ہر چھوٹا بڑا اُردو سیکھنے کی جستجو میں تھا، جہاں بنگالی ادیبوں نے اُردو کی درجنوں کتابوں کے ترجمے بڑے خلوص کے ساتھ بنگلہ زبان میں کیے، جہاں دو صدیوں سے خالص بنگالی ادیبوں کے ہاتھوں اردو کی تالیف و تصنیف کا کام جاری تھا، جہاں یومِ اقبال اور یومِ استقلال کے جشن بنگالی اداروں کی طرف سے بڑے اہتمام سے منائے جاتے تھے اور جہاں اُردو کو آسمانی زبان تصور کیا جاتا تھا، وہیں اُردو کی بے گور و کفن لاش کو بے دردی کے ساتھ پیروں تلے روندا گیا، اُردو والوں کا قتلِ عام ہوا، اُن کی عورتوں کی بے حرمتی کی گئی، اُن

کے بچوں کو جیتا جاگتا نیزوں پر بلند کیا گیا؛ اُن کے گھروں کو نذرِ آتش کیا گیا اور اُنھیں اس طرح دیس نکالا دیا گیا کہ اب وہاں اردو کا نام لیوا کوئی نہیں۔ یہ سب کچھ کیوں ہوا اور اس المناک صورتِ حال کا ذمہ دار کون ہے، بہت بڑے سوال ہیں جن کا جواب سوائے اس کے اور کیا دوں کہ:

"آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں"

میری غزل: اپنی غزلوں کے متعلق میں خود اپنی زبان سے کچھ کہوں، یہ بات سنجیدہ مزاجی کو زیب نہیں دیتی حالانکہ میں ان غزلوں کے تمام مضبوط اور کمزور پہلوؤں سے پوری طرح باخبر ہوں اور اگر چاہوں تو اُن پر بےلاگ تبصرہ بھی کر سکتا ہوں لیکن اس قسم کے کسی اقدام سے یہ غلط فہمی پیدا ہونے کا امکان ہے کہ مجھے اپنے قارئین کے ذوق پر اعتماد نہیں۔ اس لئے اس باب میں کچھ نہیں کہتا اور فیصلہ اہلِ نظر پر چھوڑتا ہوں، ہاں کچھ باتوں کا ذکر بیشک ضروری سمجھتا ہوں۔ اول یہ کہ میں نے اپنی غزل سے کچھ ایسے کام لینے کی بھی کوشش کی ہے جو عام طور پر غزل کے فرائض میں شامل نہیں سمجھے جاتے اور اس مقصد کی تکمیل کے لئے مجھے اکثر اپنا لہجہ بھی بدلنا پڑا ہے۔ اللہ جانے مجھے اس مقصد میں کس حد تک کامیابی حاصل ہوئی۔ دوم یہ کہ پرائی زمینوں میں غزل کہنا مجھے پسند نہیں لیکن اکثر طرحی مشاعروں نے

ایسا کرنے پر مجبور کیا ہے جس کا مقصد نہ کسی کی ہمسری ہے نہ تقلید۔ آخری بات یہ کہ میرے بعض زخم اتنے گہرے ہیں کہ انھیں فراموش کر دینا میرے لئے ممکن نہیں، اس لئے میں نے کہیں کہیں اپنے آپ کو دوہرایا بھی ہے جو اچھی بات نہیں لیکن مجبوری ہے۔

عروض: انٹرمیڈیٹ سے ایم۔ اے تک علمِ عروض اردو کے نصاب میں داخل ہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ میں نے ایک مدت تک عروض کا درس لیا بھی ہے اور دیا بھی ہے، لیکن مجھے اعتراف ہے کہ شعر کی اس خشک سائنس کو میری طبیعت نے کبھی خوشی سے قبول نہیں کیا اور میں اس کام کو ہمیشہ ایک ناخوشگوار فریضہ سمجھ کر انجام دیتا رہا بلکہ اپنے طلبہ کو بھی میں نے یہی سمجھایا کہ اگر کسی کو شعر کہنے کا شوق ہو تو عروض کی صرف موٹی موٹی باتوں کا علم کافی ہے۔ اس معاملے میں مُوشگافی اور سخت گیری اچھی نہیں ہوتی۔ چنانچہ شعر کہتے وقت میرے سامنے صرف ایک معیار رہا ہے اور وہ یہ کہ جو بات ذوقِ سلیم اور ذوقِ سماعت کو گوارا ہو وہ صحیح ہے ورنہ غلط ہے اور بس۔ ایسی صورت میں اگر آپ میرے بعض اشعار میں عروضی نقائص دریافت کر لیں تو مجھے اس بات پر نہ حیرت ہوگی نہ غصّہ آئے گا، بلکہ آپ کو میرے یہاں عروض سے دانستہ بغاوت کی مثالیں بھی کہیں کہیں مل سکتی ہیں۔ آپ میرے اس خیال سے اتفاق کریں گے کہ اگر کسی شخص کو اللہ تعالیٰ نے موزونیٔ طبع کے ساتھ ساتھ

ذوقِ سلیم اور شوقِ مطالعہ سے بھی سرفراز نہ فرمایا ہو تو عروض کی درجنوں کتابیں پڑھنے اور ساری زندگی ریاض کرنے کے باوجود اُس میں اچھا شعر کہنے کی صلاحیت پیدا نہیں ہو سکتی۔

ترتیب و تدوین: میں نے باقاعدہ بیاض کبھی نہیں رکھی، جو کچھ کہا ذہن میں محفوظ رہا اور پیش کیا جاتا رہا، لیکن یاد داشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جو غزلیں سنائی جاتی رہیں وہ یاد رہیں اور پُرانی غزلیں جزوی یا کُلّی طور پر نذرِ طاقِ نسیاں ہوتی چلی گئیں۔ طباعت کا سوال پیدا ہوا تو غزلیں جمع کرنے میں بڑی دِقّت پیش آئی۔ بہر حال جہاں تک حافظے نے ساتھ دیا زیادہ سے زیادہ غزلیں ذہن سے کاغذ پر مُنتقل کرا دی گئیں۔ اِن غزلوں میں وہ غزلیں بھی شامل کر دی گئیں جو رسائل میں شائع ہو چکی تھیں یا ڈائریوں میں بکھری پڑی تھیں۔ اس طرح مشکل سے کوئی دو سو غزلیں ہاتھ آئیں جو اصل تعداد سے بہت کم ہیں۔ اِن غزلوں میں سے میں نے ساٹھ سے ستّر غزلیں بے دردی کے ساتھ قلم زد کر دیں۔ کبھی فرصت ہو گی تو اِن میں سے منتخب اشعار نکال لوں گا۔ جو غزلیں انتخاب میں آئیں اُن کے اشعار کی تعداد بھی میں کم کرتا چلا گیا یہاں تک کہ بعض غزلیں مطلع یا مقطع یا دونوں سے محروم ہو گئیں اور بعض غزلیں صرف چار یا پانچ اشعار کی رہ گئیں۔ یہ تعداد اور کم کرتا لیکن اس صورت میں کتاب

کا معقول حجم برقرار نہ رہتا۔ غزلوں کی ترتیب میں نے یہ رکھی ہے کہ زمانۂ حال سے ماضی کی طرف لوٹتا ہوں۔ یعنی اس مجموعے کی ابتدائی پچاس غزلوں کو آپ ۱۹۶۰ء سے اِس وقت تک کی سمجھ لیں۔ اِس کے بعد کی کوئی چالیس غزلوں کو ۱۹۵۰ء سے ۱۹۶۰ء کے درمیان کی اور باقی کو اس سے پہلے کی۔ ابتدائی غزلوں کے بعض اشعار میں مجھے کمزوریاں نظر آئیں اور جی چاہا کہ انھیں درست کر دوں لیکن اس طرح ماضی سے میرا رشتہ ٹوٹ جاتا جو مجھے گوارا نہیں، اس لئے میں نے اِن غزلوں کو بالکل نہیں چھیڑا جیسی تھیں ویسی ہی رہنے دیں۔ بوجوہ ظاہر اس کتاب کی ترتیب و تدوین میرے بس کی بات نہیں تھی، لیکن میرے بعض مخلصین نے اس کام کو میرے لئے آسان بنا دیا۔ اس سلسلے میں مجھے جناب مظہر جلیل شوقؔ جناب سید امیر حسن امیرؔ جناب غلام محی الدین احمدؔ اشرفی جناب خواجہ حمید الدین شاہدؔ جناب مشتاق احمدؔ چاندنا، جناب اعجاز الحق قدوسی اور عزیزم ظفر جمیل کے بے لوث تعاون کا اعتراف ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اس بات کا ذکر میرے بزرگ احباب کو گوارا نہ ہوگا، اور میں بھی رسمی شکریہ ادا کر کے ان کے خلوص کی توہین نہیں کرنا چاہتا۔ اس مختصر ذکر کا مقصد صرف یہ واضح کرنا ہے کہ اس زمانے میں بھی جذبۂ اخلاص اور جذبۂ خداترسی نایاب نہیں۔

ایک ضروری وضاحت : میری غزلوں میں کچھ اشعار ایسے بھی ملیں گے جن سے بعض حضرات کے کان کھڑے ہو سکتے ہیں بلکہ اُن کے ماتھے پر بَل بھی پڑ سکتے ہیں۔ اس لئے میں ابھی سے وضاحت کیے دیتا ہوں کہ اُن چند غزلوں کے علاوہ جو میں نے پچھلے دو تین برسوں میں کہی ہیں اس مجموعے کی باقی تمام غزلیں سقوطِ ڈھاکہ سے پہلے کی ہیں اور مشرقی پاکستان میں بیٹھ کر کہی گئی ہیں، اس لئے میری کسی غزل یا کسی شعر کی غلط تاویل میرے ساتھ سراسر بے انصافی ہو گی۔ مزید اطمینان کے لئے میں نے بعض غزلوں کا پس منظر حواشی میں واضح کر دیا ہے۔ اس وضاحت کے باوجود اگر کسی کو یہ محسوس ہو کہ میرے کسی شعر کا اطلاق آج کے حالات پر بھی ہوتا ہے تو اسے حُسنِ اتفاق بلکہ سوءِ اتفاق سمجھ لیا جائے، اور کیا عرض کروں۔ اِسی طرح جہاں کہیں میں نے رہنماؤں کو ہدفِ تنقید بنایا ہے وہاں بھی میرا اشارہ اُن برخود غلط لوگوں کی طرف ہے جنھوں نے رہنمائی کے نام پر قوم کا بیڑا غرق کیا۔ اِس قسم کے شعروں کو اُن رہنماؤں سے ہرگز منسوب نہیں کیا جانا چاہیے جن کے خلوصِ نیت کے سب قائل ہیں اور جنھوں نے واقعی رہنمائی کا حق ادا کیا ہے۔

دُعائیں : میں اپنے کرم فرما جناب حبیب اللہ بٹ چیرمین بروک بانڈ پاکستان لمیٹڈ کا بے حد ممنون ہوں، کہ اُنھوں نے رضاکارانہ طور پر

اپنی کمپنی کی جانب سے بڑی اولوالعزمی کے ساتھ اس کتاب کی طباعت و اشاعت کا اہتمام فرمایا۔ دست بدعا ہوں کہ اللہ تعالیٰ انھیں اِس بے لوث جذبۂ ادب دوستی کا اجر عطا فرمائے اور ان کا یہ اقدام دوسرے اہلِ استطاعت کے لئے مثال ثابت ہو۔

برادرم منظفر احمد بھٹہ کے لئے بھی میرے دل سے دعائیں نکلتی ہیں کہ انھوں نے مجھ فقیر بے نوا کو قابلِ توجہ سمجھا اور طباعت کے انتظامات میں پورے انہماک سے دلچسپی لی۔

اقبال عظیم

شعری سفر
(پیش لفظ دیوانِ دوم)

کراچی میں میرے قیام کو اب گیارہ سال ہو چکے اور یہ مدت میں نے گھر میں بیٹھ کر نہیں گزاری اس لئے اب اس قسم کا تعارف ضروری نہیں رہا جیسا کہ مضراب کی اشاعت کے وقت محسوس ہوا تھا تاہم یقینی نہیں کہ اس کتاب کا ہر قاری مجھ سے واقف اور میرے حالات سے باخبر ہو اس لئے دستورِ وقت کے مطابق عرض کرتا ہوں کہ میرا نام تو کتاب کی جلد ہی پر نظر آجائے گا، چہرہ شناسی کے لئے کتاب میں ایک حالیہ تصویر موجود ہے اور اگر مزاج دانی مقصود ہو تو ابتدائی چند غزلوں کا مطالعہ کافی ہوگا۔

میری تاریخِ پیدائش ۸/جولائی ۱۹۱۳ء، جائے پیدائش میرٹھ اور آبائی وطن قصبہ انبٹھ ضلع سہارن پور ہے جسے پہلی اور آخری دفعہ میں نے والدین کے انتقال کے بہت بعد دیکھا اور وہ بھی یوں کہ شادی کفو میں ہوئی۔ ورنہ یہ سعادت بھی کبھی حاصل نہ ہوتی۔ عمر کا وہ حصہ لکھنؤ میں گزارا جس میں شعور اپنی راہیں متعین کرتا ہے اور قلب و دماغ تربیت و تہذیب کی منزلیں طے کرتے ہیں۔ اس لئے لکھنؤ سے وہی تعلقِ خاطر ہے جو کسی کو مادرِ وطن سے ہونا چاہیئے۔

میں نے ہائی اسکول کا امتحان ۱۹۳۰ء میں گورنمنٹ اسکول اناؤ سے۔ انٹر کا ۱۹۳۲ء میں کرسچین کالج لکھنؤ سے بی۔ اے کا امتحان ۱۹۳۴ء میں لکھنؤ یونیورسٹی سے اور اردو میں ایم۔ اے، آگرہ یونیورسٹی سے ۱۹۴۳ء میں پاس کیا۔ لبعد ازاں تحقیقی کام کے لئے ڈھاکہ یونیورسٹی سے منسلک رہا۔ تربیتِ معلمی ٹیچرس ٹریننگ کالج لکھنؤ سے حاصل کی۔ ہندی کا امتحان ہندوستان میں اور بنگلا کا امتحان سابق مشرقی پاکستان میں پاس کیا۔

عربی انٹر تک نصاب میں شامل رہی اور فارسی کا ایک ایک پرچہ بی اے اور ایم۔اے کے امتحانوں میں لازمی تھا۔

گورنمنٹ جوبلی کالج لکھنؤ میں عارضی ملازمت کے بعد معلم کی حیثیت سے میری سرکاری ملازمت کا سلسلہ مارچ ۱۹۳۹ء سے شروع ہوا اور جولائی ۱۹۵۰ء تک جاری رہا۔ اس کے بعد میں ڈھاکے چلا گیا جہاں سرکاری ڈگری کالجوں میں تقریباً بیس سال تک پروفیسر اور صدر شعبۂ اردو کی حیثیت سے کام کرتا رہا۔ اس دورِ ملازمت کے آخری پانچ سال میں نے صوبائی سکریٹریٹ میں ریسرچ آفیسر کی حیثیت سے گزارے اور ۱۹ ضلعوں کے لئے تعلیم و ادبیات پر ابواب لکھنے کی خدمات انجام دیں۔ فروری ۱۹۷۰ء میں پنشن لے کر بھائی صاحب کے پاس لاہور آ گیا اور اب جولائی ۱۹۷۰ء سے بچوں کے ساتھ کراچی میں مقیم ہوں۔

تصنیف و تالیف کی صورت یہ ہے کہ میری غزلوں کا پہلا مجموعہ "مضراب" ۱۹۷۵ء میں اور نعتوں کا مجموعہ "قابَ قوسین" ۱۹۷۷ء میں شائع ہوا اور غزلیات کا دوسرا مجموعہ "مضراب و رباب" آپ کے سامنے ہے۔ نثر میں ایک ضخیم کتاب "مشرقی بنگال میں اردو" ہے جو مشرقی پاکستان سے متعلق اردو زبان و ادب کا دوسو سالہ تذکرہ ہے اور ایک کتاب "سات ستارے" کے نام سے ہے جس میں پاکستان کے سات معماروں کا احوال ہے۔ علاوہ ازیں بنگالہ ترقیاتی بورڈ کی جانب سے "اردو بنگلا لغت" کا حصۂ اردو میری ادارت میں شائع ہوا اور وہیں میں نے حکیم ناطق لکھنوی کا دیوان مرتب کر کے شائع کیا۔

اپنی ذات سے متعلق بنیادی معلومات فراہم کر دینے کے بعد ضروری سمجھتا ہوں کہ آغازِ شعرگوئی سے اس وقت تک کے سفرِ شاعری کی رُوداد مختصراً پیشِ خدمت کر دوں اس لئے عرض کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے ہم بھائی بہنوں کو جن بے شمار نعمتوں سے سرفراز فرمایا اُن میں ایک نعمت یہ بھی ہے کہ ہم نے ایک دینی و علمی ماحول میں آنکھیں کھولیں اور ادبی ذوق ہمیں ترکے میں میسّر آیا۔ دادا صاحب قبلہ حضرت سیّد فضل عظیم فضل اردو فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ والد صاحب قبلہ حضرت سیّد مقبول عظیم عرشؔ اردو کے مسلم الثبوت غزل گو شاعر تھے اور نانا صاحب قبلہ حضرت ادیبؔ میرٹھی بھی صاحبِ دیوان شاعر اور حضرت بیاںؔ و یزدانیؔ میرٹھی کے مشہور تلامذہ میں سے ایک تھے۔ دادا صاحب قبلہ کا کلام میری نظر سے نہیں گزرا البتہ

والد صاحب قبلہ کو مشاعروں میں پڑھتے سُنا اور اُن کی بیاضیں بھی بھائی صاحب کے پاس دیکھیں۔ کِلک کے قلم اور سیاہ روشنائی سے لکھا ہوا نانا صاحب قبلہ کا خود نوشت دیوان بھی اب تک محفوظ ہے۔ اور اس کی تحریر اتنی خوبصورت ہے کہ اس پر مطبوعہ کتاب کا گمان ہوتا ہے۔ نانا صاحب کے قلمدان میں پچاس پچاس برس پُرانے کِلک کے قلم میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں۔ اگرچہ یہ تذکرہ "پدرم سلطاں بود" والی بات ہے۔ تاہم مجھے اس نسبت پر ناز ہے اور اسی قدر فخر اِس امر پر ہے کہ میری بساط کے مطابق قدرت نے مجھے اِس خاندانی روایت کے تحفّظ کی توفیق عطا فرمائی۔

آج اپنے ماضی پر نگاہ ڈالتا ہوں تو صاف نظر آتا ہے کہ فنِ شعرگوئی میں میری ذہنی تربیت کا آغاز اُسی وقت ہو چکا تھا جب میں گورنمنٹ ہائی اسکول اناؤ میں درجہ ہشتم کا طالب علم تھا۔ یہ وہی ضلع اناؤ ہے جس نے دنیائے شعر و ادب کو مولانا حسرت موہانی، سید آلِ رضا اور بابو جگت موہن رواں جیسے اکابرِ سخن عطا فرمائے اور جس کی آغوش میں جسٹس محمّد رضا کے اُن فرزندوں نے پرورش پائی جو آگے چل کر اپنے اپنے شعبۂ حیات میں قدآور شخصیتوں کے مالک ہوئے۔

یہ اُس زمانے کی بات ہے جب والد صاحب اپنی سرکاری ملازمت کی آخری منزلوں سے گزر رہے تھے۔ نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی وہاں ڈپٹی کلکٹر کی حیثیت سے مامور تھے۔ بابو جگت موہن رواں زندہ تھے۔ مولانا حسرت موہانی و سید آلِ رضا کی غزلیں فضا میں گونج رہی تھیں اور شہر میں فیض آباد، جونپور، اور بنارس کے کچھ پختہ مشق شعرا بھی قیام پذیر تھے۔ آئے دن شعری نشستیں ہوتی تھیں۔ ہمارے اسکول کی جانب سے بھی سال میں ایک بار حضرت اثر لکھنوی کی زیرِ صدارت ایک مشاعرہ بڑے پیمانے پر منعقد ہوتا تھا جس میں مذکور حضرات کے علاوہ لکھنؤ اور کانپور کے شعرا کرام بھی شرکت فرماتے تھے۔ ان مشاعروں کے لئے سرگرم رضاکار کی حیثیت سے خدمات انجام دینا، مشاعروں سے پسندیدہ غزلیں نقل کر کے لانا اور انہیں ازبر کر کے احباب کو ترنم سے سُنانا اُس زمانے میں میرا محبوب ترین مشغلہ تھا۔ اسکول میں بیت بازی کے مقابلوں کا بھی زور تھا جس کے لئے سیکڑوں اشعار یاد کرنا پڑتے تھے۔ چنانچہ اس ضمن میں مولانا حسرت موہانی اور سید آلِ رضا کی بے شمار غزلیں مجھے خصوصیت سے یاد تھیں۔

حضرت اثر لکھنوی، بابو جگت موہن رواں، حضرت رضی جونپوری، حضرت فرخ بنارسی اور حضرت ثاقب بریلوی والد صاحب کے خاص دوستوں میں تھے۔ ان حضرات کو گھر پر اکثر مہمان ہوتے دیکھا اور شعر پڑھتے سنا۔ حضرت ثاقب کانپوری اور حضرت ذرہ کانپوری بھی وہاں اُس زمانے میں مقبول تھے۔

والد صاحب شہر اناؤ سے تبدیل ہو کر تحصیل حسن گنج پہنچے تو قصبہ "موہان" وہاں سے بہت قریب تھا جب کبھی معلوم ہوتا کہ مولانا حسرت موہانی آئے ہوئے ہیں تو والد صاحب کے ساتھ اُن کی خدمت میں حاضری کی سعادت ضرور حاصل ہوتی تھی۔ کئی مرتبہ والد صاحب موہان سے واپس آتے ہوئے مولانا حسرت کو بھی حسن گنج لے آئے جہاں اُنہوں نے کئی کئی گھنٹے قیام فرمایا اور والد صاحب کے اصرار کے باوجود یکہ کے بجائے پیدل ہی موہان واپس گئے حالانکہ تقریباً ایک گھنٹے کا سفر تھا۔

اس سبق آموز ادبی فضا میں زندگی کے کچھ بیش قیمت دن گذارنے کے بعد مزید تعلیم کے لئے لکھنؤ چلا گیا، جہاں بھائی صاحب پہلے ہی سے موجود تھے اور چند سال بعد والد صاحب نے بھی پنشن لے کر لکھنؤ میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ ہمارے گھر کے بائیں جانب کوئی ایک سو قدم کے فاصلے پر حضرت نیاز فتح پوری کا دولت کدہ اور ماہ نامہ نگار کا دفتر تھا اور دائیں جانب تقریباً اسی فاصلے پر حضرت عبدالباری آسی اُلدنی کا مکان تھا جبکہ تیسری جانب کوئی ایک فرلانگ دُور حضرت قدیر لکھنوی کا قیام تھا۔ ان حضرات سے والد صاحب کے دوستانہ تعلقات ہو گئے اور بعد ازاں نواب جعفر علی خاں اثر بھی پنشن لے کر لکھنؤ آ گئے۔

رفتہ رفتہ جناب بہزاد لکھنوی، شاہ بیدم وارثی، جناب وصل بلگرامی اور جناب سراج لکھنوی بھی والد صاحب کے حلقۂ احباب میں شامل ہو گئے اور مقامی مشاعروں میں والد صاحب کی شرکت شروع ہو گئی۔ ترنم اُنہوں نے غضب کا پایا تھا اور شعر بھی صاف، سادہ اور پاکیزہ کہتے تھے۔ لہٰذا دیکھتے ہی دیکھتے ادبی حلقوں میں خاص مقام حاصل کر لیا یہاں تک کہ جب حضرت نیاز فتح پوری نے "نگار" کے ایک شمارے میں لکھنؤ کے اساتذۂ سخن کی فہرست نمونۂ کلام کے ساتھ شائع فرمائی تو والد صاحب قبلہ کا نام اس فہرست میں شامل تھا اور نمونۂ کلام کے طور پر یہ

شعر نقل کیا گیا تھا:

دو آنسو بہہ گئے تو ہوئی درد میں کمی
رونے کا ورنہ شوق نہیں چارہ گر مجھے

پھر ہمارے گھر پر بھی نشستیں ہونے لگیں جن میں یہ تمام حضرات شرکت فرماتے تھے۔ اُسی زمانے میں حضرت قدیر لکھنوی اور حضرت آسی کی سفارش پر مجھے طرحی مشاعروں میں شرکت کی اجازت مِل گئی۔

۱۹۳۵ء میں والد صاحب کے انتقال کے بعد اِن حضرات کی ہمارے گھر آمد کا سلسلہ ختم ہو گیا مگر والد صاحب کے تمام احباب کی خدمت میں میری حاضری بدستور جاری رہی۔ یہ تمام حضرات بھی مجھ پر شفقت فرماتے رہے اور مقامی نشستوں میں میری شرکت بھی ہوتی رہی جس کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ برادرم ارم لکھنوی کی معیت میں حضرت آرزو، حضرت صفی اور حضرت اثر لکھنوی تک رسائی کی سبیل نکل آئی۔ میں اسے اپنی خوش نصیبی سمجھتا ہوں کہ میں نے اپنی ابتدائی دو دو غزلیں ان تینوں بزرگوں کی خدمت میں پیش کیں اور اُنہوں نے بڑی محبت سے میری رہنمائی فرمائی۔ ارادہ میرا یہ تھا کہ ان بزرگوں میں سے جس کو اپنی طبیعت کے مطابق پاؤں گا اس کے دامنِ ہدایت سے وابستہ ہو جاؤں گا لیکن کسی فیصلے پر پہنچنے سے قبل مجھے سرکاری ملازمت کا پروانہ مِل گیا اور لکھنؤ کو خیرباد کہہ دینا پڑا، تاہم یہ حقیقت ہے کہ راہِ سخن میں جو خود اعتمادی و ثابت قدمی مجھے نصیب ہوئی اسے میں انہیں بزرگوں کی ہمت افزائی کا صلہ جانتا ہوں۔

چار سال تک مقامی مشاعروں میں شرکت کے بعد میں نے قدم گھر سے باہر نکالا اور جہاں تک مجھے یاد ہے میرا پہلا بڑا مشاعرہ وہ تھا جو ۱۹۴۲ء میں فہیم کالج۔ کانپور کی جانب سے نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی کی صدارت میں منعقد ہوا اور جس میں ملک کے تمام مشاہیر نے شرکت فرمائی۔ اس کے بعد یہ سلسلہ پوری سرگرمی و تواتر کے ساتھ ۱۹۵۰ء تک جاری رہا جب میں ڈھاکے چلا گیا۔ ساڑھے سات آٹھ سال کا یہ زمانہ وہ تھا جب جوش ملیح آبادی، حفیظ جالندھری، فراق گورکھپوری، جگر مراد آبادی، احسان دانش، روش صدیقی، اثر لکھنوی و مجاز لکھنوی کی شمولیت کسی بڑے

مشاعرے کے کامیاب ہونے کی ضمانت سمجھی جاتی تھی۔ اسی زمانے میں میری غزلیں "آج کل" "ساقی"، "ادب لطیف"، "ہمایوں"، "نیرنگ خیال" اور "زمانہ" میں شائع ہونا شروع ہوئیں۔

۱۹۵۰ء میں ڈھاکہ پہنچا تو وہاں ایک شاندار ادبی محفل سجی دیکھی جس میں علامہ رضا علی وحشت ڈاکٹر عندلیب شادانی، سید فضل احمد کریم فضلی، مولانا تمنا عمادی، حیدر دہلوی اور کیفی چریا کوٹی جیسے قدآور غزل گو شعراء تشریف فرما تھے اور خاصی بڑی تعداد میں دیگر خوش گو شعراء کلکتہ، یو۔پی اور بہار سے وہاں پہنچ چکے تھے۔ سلیم اللہ فہمی، آصف بنارسی، نظرت واسطی، احسن احمد اشک، افسر ماہ پوری، عابد داناپوری، رشید احمد، شمس شیدائی اور شبیر علی کاظمی ان میں نمایاں تھے۔ سرور بارہ بنکوی اس وقت تک وہاں نہیں پہنچے تھے سو وہ بھی ۱۹۵۱ء میں آگئے۔

مقامی شعراء میں سید شرف الحسینی، مرزا فقیر محمد، خواجہ اسماعیل ذبیح، خواجہ محمد عادل، اور ظہور المبارک پیش پیش تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے انجمن ترقی اردو کی شاخ کے علاوہ شہر شہر ادبی انجمنیں قائم ہوگئیں اور آئے دن نشستوں اور مشاعروں کا بازار گرم ہوگیا۔ سال میں کم از کم ایک کل پاک و ہند مشاعرہ بھی منعقد ہونے لگا جس میں ہندوستان اور سابق مغربی پاکستان کے قریب قریب تمام مشاہیر کی شرکت باری باری ہوتی تھی یعنی ایسی فضا میسر آئی کہ احساس ہی باقی نہ رہا کہ ادھر سے نکل کر کسی نئی جگہ جا پہنچا ہوں۔

اگرچہ ڈاکٹر شوکت سبزواری، مختار زمن، ڈاکٹر آفتاب صدیقی، نورالرحمان، واحد بخش قادری، محمد اظفر اور کلیم اللہ فہمی شعر نہیں کہتے تھے لیکن ان کے دم سے وہاں کی محفلوں میں بڑی رونق تھی۔ انہیں حضرات میں نظیر صدیقی، ارشد کاکوی جیسے مستقبل کے وقیع ادیب بھی تھے جن کی ادبی زندگی کا آغاز وہیں میرے سامنے ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ ساری رونق تھی ہی نظر لگ جانے والی چنانچہ اُسے نظر لگی اور ایسی لگی کہ دیکھتے ہی دیکھتے سب کچھ خاک میں مل گیا اور وہ مکتبۂ فکر جو تیز رفتاری کے ساتھ دبستانِ مشرق کی شکل اختیار کر رہا تھا نذرِ سقوط ہوگیا۔

یوں زندگی کے بیس قیمتی سال مشرقی پاکستان میں گزارنے کے بعد فروری ۱۹۷۰ء میں

پنشن لے کر میں بھائی صاحب کے پاس لاہور آ گیا۔ میری خاطر بھائی صاحب نے اپنے گھر پر ماہانہ نشستوں کا اہتمام کیا جس میں ناصر کاظمی، صوفی تبسم، احسان دانش، احمد ندیم قاسمی، قتیل شفائی اور محبوب خزاں سے قربت حاصل ہوتی رہی اور مقامی مشاعروں میں پنجاب کے دوسرے شعراء سے بھی ملاقاتیں ہوئیں جن میں ضمیر جعفری، مظفر وارثی اور کلیم عثمانی نمایاں تھے۔

جولائی ۱۹۷۰ء میں لاہور سے کراچی آ گیا جہاں میرے قیام کو تقریباً گیارہ برس ہو رہے ہیں۔ اس قیام کے دوران میں کراچی نے مجھے جو عزت اور محبت دی اُس کا شکریہ ادا کرنے کو میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ میری غزلوں کا پہلا مجموعہ "مضراب" برادرم مظفر احمد بھٹا کی کوشش اور بُرُدک بانڈ کے تعاون سے ۱۹۷۵ء میں شائع ہوا اور نعتوں کا پہلا مجموعہ "قابَ قوسین" محترمہ بیگم اے۔ کے سُومار کی توجہ اور محترم اے۔ کے سُومار کی عنایت سے ۱۹۷۷ء میں شائع ہوا اور یہ دونوں کتابیں اہلِ علم و ادب کی نگاہ میں پذیرائی کی مستحق ٹھہریں۔ اب مضراب و رباب آپ کے سامنے ہے۔ میں اِن ادب دوست کرم فرماؤں کی خدمت میں خصوصیت کے ساتھ ہدیۂ تشکر پیش کرتا ہوں جنھوں نے گذشتہ دو کتابوں پر التفات فرما کر زیرِ نظر کتاب کی اشاعت پر مائل کیا۔

پچھلے گیارہ برسوں میں مجھے بے شمار مشاعروں اور نشستوں میں شرکت کا موقع ملا جن کے توسط سے یہاں کے تمام بزرگ و خُرد سخن وروں سے خوشگوار تعلقات پیدا ہوتے چلے گئے لیکن افسوس کہ اُن میں سے متعدد اہم شخصیتیں ہماری محفلوں کو ویران کر گئیں۔ نجم آفندی، سید آلِ رضا، رعنا اکبر آبادی، سید محمد جعفری، ماہر القادری، ابن انشا، سراج الدین ظفر، زیڈ۔ اے۔ بخاری، بہزاد لکھنوی، مصطفیٰ زیدی، سرور بارہ بنکوی، بہار کوٹی، شیوہ بریلوی، امیر کلاوٹھی، منظر جلیل شوق، غلام محی الدین اشرفی، عزیز الحق، شجاع الرحمان اثر، سعید عرج مظہر، اے۔ ڈی اظہر، حکیم اشرف و اظہر نفیس اب ہمارے درمیان موجود نہیں۔ اسی طرح ربع صدی تک کمال وضع داری کے ساتھ ہفتہ واری محفلِ شعر سجانے والے غلام محمد صالح بھی ہم سے مُنہ موڑ گئے

لیکن جب کبھی کوئی مخصوص نشست منعقد ہوتی ہے تو صالح صاحب کی محفل اور ان کا حسنِ اخلاق یاد آجاتا ہے۔

اگرچہ مذکورہ سخن وروں میں سے ہر ایک کی رحلت نے کراچی کی ادبی زندگی میں ایک خلاء پیدا کر دیا۔ تاہم یہ بات بھی طمانیت کے لئے کم نہیں کہ ہماری نئی نسل جس میں کچھ ذہین و باصلاحیت نوعمر خواتین بھی شامل ہیں اس اعتبار کو برقرار رکھنے میں پختہ مشق شعراء کا ہاتھ بٹا رہی ہے جو دبستانِ کراچی کا طرۂ امتیاز ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ شہر میں نئے شعراء و شاعرات کی تعداد بڑی تیز رفتاری سے بڑھ رہی ہے یہاں تک کہ گھروں پر منعقد ہونے والی مخصوص محافل میں بھی تیس ۳۰ پینتس ۳۵ سخن وروں کا موجود ہونا اب ایک معمول سا بن گیا ہے اور یہ صورتِ حال یقیناً خطرناک اور معیارِ شاعری کے حق میں مضر ہے جس کی طرف توجہ کی فوری ضرورت ہے، پھر بھی کراچی کی مشینی زندگی اور خالصتاً معاشی فضا میں نوجوانوں سے اس قسم کے اشعار سنتا ہوں تو جی خوش ہوتا ہے، گردن فخر سے اونچی ہوتی ہے اور مستقبل کی روشنی صاف نظر آنے لگتی ہے۔

میں سچ کہوں گی مگر اس سے ہار جاؤں گی
وہ جھوٹ بولے گا اور لاجواب کر دے گا (پروین شاکر)

اس ترکِ رفاقت کا مجھے رنج ہے لیکن
اب تک کے ترے ساتھ پہ حیرت بھی بہت ہے (پروین شاکر)

تھکن بہت تھی مگر سایۂ شجر میں جمال
میں بیٹھتا تو مرا ہم سفر چلا جاتا (جمال احسانی)

اب اس سے کیجئے کیا شکوہ ہائے کم نگہی
بہت دنوں میں تو اس نے ادھر نظر کی ہے (جمال احسانی)

وہ مجھے خوشیاں نہ دے اور میری آنکھیں نم نہ ہوں
یہ ہے پیماں زندگی کے اور میرے درمیاں (حسن جمال اکبر)

اگر چلو تو مرے ساتھ ہی چلو لیکن
کٹھن سفر سے زیادہ ہے ہم سفر ہونا (پیرزادہ قاسم)

صبح کا بھولا ہوا شام کو آ سکتا ہے
اپنی دہلیز پہ اک دیپ جلائے رکھنا (امتیاز ساغر)

در دریچے تو سارے کھلے ہیں مگر
دھواں ہے کہ گھر سے نکلتا نہیں (نام یاد نہیں)

کپاس چنتے ہوئے ہاتھ کتنے پیارے لگے
مجھے زمیں سے محبت کے استعارے لگے (عشرت آفریں)

بات کردار کی ہوتی ہے وگرنہ عارف
قد میں انسان سے سایہ بھی بڑا ہوتا ہے (راشد عارف)

سوچتا تھا غم میں بھر آتی ہیں آنکھیں کس لئے
چوٹ اپنے دل پہ جب کھائی تو اندازہ ہوا (غافل اکبرآبادی)

جب مرے گھر میں لگی آگ تو معلوم ہوا
کون اپنا ہے یہاں، کون تماشائی ہے (ایچ رحیم)

تھا کون مرے قتل کی دیتا جو گواہی
لوگوں نے تو کھولے نہیں دروازے بھی گھر کے (حسن اللہ ہما)

میں نے اکثر عشرت آفریں، فاطمہ حسن، شاہدہ حسن، انور شعور اور سلیم کوثر جیسے نوجوانوں کو اکثر اچھے اچھے شعر پڑھتے سنا ہے لیکن وہ پوری طرح مجھے یاد نہیں اس لئے انھیں چند اشعار پر اکتفا کرتا ہوں جو میرا مقصد سمجھ لینے کو کافی ہیں۔

مستقبل کی روشنی کا ذکر خود میرے مستقبل کے حوالے سے نہیں ہے بلکہ میرے سامنے کراچی کے شعری ادب کا مستقبل ہے جس کے روزافزوں ارتقاء کے لئے میں دعاگو ہوں۔ جہاں تک میری ذات کا سوال ہے، میں زندگی کے سخت مرحلوں سے خوش وناخوش گزر آیا اور اب ہر سانس کے ساتھ خود کو منزلِ آخرت سے قریب تر محسوس کرتا ہوں، اس لئے

میرا مستقبل کیا اور اُس کی روشنی کیا؟ لیکن یہ ضرور ہے کہ جب کبھی کسی بزمِ سخن میں شرکت ہوتی ہے تو سارا ماضی سمٹ کر میری بند آنکھوں میں اُتر آتا ہے اور میں سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہوں کہ اگر میرے شوقِ غزل گوئی نے میرا ساتھ نہ دیا ہوتا تو نظربندی کی موجودہ زندگی کتنی ویران گزرتی۔ شاید دروازے پر دستک دینے والا بھی کوئی میسر نہ آتا اس لئے کہ میرے اور میرے رفیقوں، شناساؤں اور چھوٹے بڑے قدردانوں کے درمیان محبت کا جو رشتہ ماضی میں قائم ہوا اور اب بھی قائم ہے وہ فی الحقیقت غزل ہی کے توسط سے تھا اور ہے۔ زندگی میں جو کچھ عزت مجھے حاصل ہوئی اور میرے قارئین و سامعین کے دلوں میں میرے لئے جو کچھ بھی جگہ پیدا ہوئی اس کا سہرا بھی میری غزل ہی کے سر ہے۔ میری غزل نے ریاست رام پور سے کلکتے تک ہندوستان کے تمام بارونق شہروں کی سیر کرائی اور برِصغیر کے جملہ قابلِ ذکر سخنوروں سے ملاقات کا شرف بخشا۔ میری غزل ہی لکھنؤ اور اودھ کی رومان پرور فضا میں میری شریکِ سفر رہی اور میری غزل ہی نے زندگی کے وہ ناقابلِ فراموش شب و روز عطا کئے جو میں نے بیس سال تک مشرقی پاکستان کے سبزہ زاروں میں گزارے۔ یہ میری غزل ہی کا کرشمہ تھا کہ نقلِ وطن کے بعد بھی کلکتہ، لکھنؤ، دیوا شریف، راولپنڈی اور کراچی میں منعقد ہونے والے مشاعروں کے دعوت ناموں نے ڈھاکہ جیسے دُور افتادہ مقام تک میرا تعاقب کیا اور یہ احسانِ عظیم بھی میری غزل ہی کا ہے کہ اُس کی بدولت مجھے سرزمینِ حجاز تک پہنچنے اور آستانِ رسولؐ پر حاضری دینے کی سعادت حاصل ہوئی۔ میری بجھی ہوئی آنکھوں کے باوجود مدینے کی گلیوں تک میری محفوظ اور معتبر رہنمائی مجھ پر غزل کا اتنا بڑا احسان ہے کہ میں خود اپنی غزل کا احترام کرنے پر مجبور ہوں۔ دیارِ رسولؐ تک رسائی کو میں اپنی زندگی کا حاصل اور ذوقِ غزل گوئی کا سب سے بڑا انعام جانتا ہوں جس کے لئے میرے بدن کا رُواں رُواں اللہ تعالیٰ کے کرم بے حد کا شکر گزار ہے۔

جس وقت میں یہ آخری چند سطریں قلم بند کر رہا ہوں اس سے کچھ دیر پہلے مجھے نیویارک کے ایک مشاعرے میں شرکت کی دعوت دی گئی ہے۔ اِس قسم کی دعوت کسی شاعر کے لئے بھی ایک اعزاز کی بات ہے اور جھوٹ کیوں بولوں میں بھی اس بات پر خوش ہوں بلکہ مشروط رضامندی کا اظہار بھی کر چکا ہوں۔ اگر یہ مشاعرہ منعقد ہوا اور میرے ڈاکٹر نے بائیس (۲۲) گھنٹے کے ہوائی سفر کی اجازت دیدی تو انشاءاللہ شرکت کا امکان ہے لیکن جی یہی چاہتا ہے کہ نیویارک کے اہلِ ذوق کے بجائے مدینے کی گلیوں کا کوئی گداگر مجھے آواز دے میں اُڑ کر وہاں جا پہنچوں اور گنبدِ خضرا کے زیرِ سایہ بابِ جبریل کی چوکھٹ پر بیٹھ کر ساری زندگی نعتِ رسولؐ کہتا رہوں پڑھتا رہوں کہتا رہوں پڑھتا رہوں۔ وہ نعت جس کی راہ بھی مجھے میری غزل نے سمجھائی ہے۔

اقبال عظیم

نعتیہ کلام

نعتیں

(قافیہ، ردیف اور صفحہ)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

حمد

نام بھی تیرا عقیدت سے لیے جاتا ہوں
ہر قدم پر تجھے سجدے بھی کیے جاتا ہوں

کوئی دنیا میں مِرا مونس و غمخوار نہیں
تیری رحمت کے سہارے پہ جیے جاتا ہوں

تیرے اوصاف میں اک وصف خطا پوشی ہے
اس بھروسے پہ خطائیں بھی کیے جاتا ہوں

آزمائش کا محل ہو کہ مسرّت کا مقام
سجدۂ شکر بہر حال کیے جاتا ہوں

زندگی نام ہے اللہ پہ مر مِٹنے کا
یہ سبق سارے زمانے کو دیے جاتا ہوں

صبر کرنا ہے تری شانِ کریمی کو عزیز
میں یہی سوچ کے آنسو بھی پیے جاتا ہوں

ہر گھڑی اُس کی رضا پیشِ نظر ہے اقبالؔ
شکر ہے، ایک سلیقے سے جیے جاتا ہوں

مناجات

ہم کو دعویٰ ہے کہ ہم بھی ہیں نکوکاروں میں
اور اللہ کے بے لوث وفاداروں میں

حرمِ پاک سے بھی خاص عقیدت ہے ہمیں
اور شامل ہیں محمدؐ کے رضاکاروں میں

ہم مگر عصمت و عفّت کا سبق بھول گئے
غیرتیں بکتی ہیں اب شہر کے بازاروں میں

نام تو لیتے ہیں ہم اب بھی خدا کا لیکن
سجدہ ریزی بھی کیے جاتے ہیں درباروں میں

خاص تقریب میں کی جاتی ہے تقسیم زکوٰۃ
اب عبادت کا یہ دستور ہے زرداروں میں

عام ہو جاتی ہے اِس جشن کی پوری روُداد
اور تصویر بھی چھپ جاتی ہے اخباروں میں

عیدِ قرباں میں نکھر آتا ہے دولت کا غرور
کتنے قارون نکل آتے ہیں بازاروں میں

اُسوۂ پاکِ محمدؐ کا بیاں کیسے کریں
نئی تہذیب کے سرگرم نمک خواروں میں

ذکرِ اسلاف کا کرتے ہیں اگر اہلِ وفا
وہ گِنے جاتے ہیں ماضی کے عزاداروں میں

اور جو لوگ محافظ تھے کبھی مذہب کے
زر خریدوں کی طرح بیٹھے ہیں سرکاروں میں

جو دیا کرتے تھے ملّت کو کبھی درسِ خودی
وہ بھی موجود ہیں اب حاشیہ برداروں میں

اے محمدؐ کے خدا ہم کو ہدایت فرما
ہم گنہ گار بھی ہیں تیرے پرستاروں میں

بیان کیسے ہوں الفاظ میں صفات اُن کی
نزولِ وحیٔ الٰہی ہے بات بات اُن کی

اُنھیں کے دَم سے منوّر ہے بزمِ کون و مکاں
زمیں سے تا بہ فلک ساری کائنات اُن کی

نہ مجھ کو خواہشِ جنّت، نہ شوقِ حور و قصور
مِری طلب کا تقاضا دِیارِ پاکِ حضورؐ

مقامِ ارضِ مدینہ کسی کو کیا معلوم
تمام حُسن و تقدّس، تمام نکہت و نور

لوگ نازاں ہیں کہ وہ حدِ یقیں تک پہنچے
یعنی اربابِ خرد ماہِ مبیں تک پہنچے

لیکن اِس دورِ کرامات سے صدیوں پہلے
میرے آقاؐ کے قدم عرشِ بریں تک پہنچے

دعا تو ہم بھی کرتے ہیں، کرن پھوٹے، سحر جاگے
زبانِ حال سے لیکن فضا کچھ اور کہتی ہے

نئی قدروں کے چرچے ہو رہے ہیں اہلِ دانش میں
مگر ہم سے حیاتِ مصطفےٰؐ کچھ اور کہتی ہے

تعلیمِ مصطفیٰؐ کا تقاضا ہے بندگی
اور بندگی بھی کس کی؟ غفورُ الرّحیم کی

ہر در پہ سجدہ ریزی غلامانہ فعل ہے
توہین ہے یہ دینِ رسولِ کریمؐ کی

اے ہادیٔ برحق انھیں کچھ خوفِ خدا دے
اے نورِ ہُدیٰؐ! اُن کو رہِ راست دکھا دے

وہ لوگ جنھیں پاسِ شریعت بھی نہیں ہے
پہنے ہوئے بیٹھے ہیں مشیخت کے لبادے

ڈوبتی جاتی ہیں نبضیں اور نظر بے نور ہے
اک مسافر ہے حرم کا جو تھکن سے چور ہے

چند سانسیں اور باقی ہیں، ذرا جلدی کرو
قافلے والو! مدینہ اور کتنی دور ہے

یہ پوچھنا ہے مجھے اپنی فردِ عصیاں سے
مجھے یہ اذنِ حضوری عطا ہوا کیسے؟

خود اپنا گھر بھی مجھے تو نظر نہیں آتا
میں گھر سے چل کے مدینے پہنچ گیا کیسے؟

میں کس سے جا کے پُوچھوں منزل کدھر ہے میری
ہر شخص کارواں میں اب میرِ کارواں ہے
صدہا چراغ روشن ہیں رہگزر میں لیکن
میں جس کو ڈھونڈھتا ہوں وہ روشنی کہاں ہے؟

آنسو بصد خلوص بہانے کا وقت ہے
لوحِ جبینِ عجز جُھکانے کا وقت ہے
محفل سجی ہوئی ہے سلام و درود کی
یہ وقت، نعتِ پاک سُنانے کا وقت ہے

سفر مدینے کا کچھ ایسا مرحلہ تو نہیں
میں بے بَصر سہی، لیکن شکستہ پا تو نہیں

وہاں سے غیر بھی پیاسے کبھی نہیں آتے
وہ شہرِ ساقیٔ کوثرؐ ہے کربلا تو نہیں

یہی وہ در ہے جہاں بے طلب بھی ملتا ہے
مجھی کو دیکھو کبھی میں نے کچھ کہا تو نہیں

بس ایک ہادیٔ برحقؐ ہے راہِ کعبہ میں
قدم قدم پہ وہاں اتنے رہنما تو نہیں

وہاں بھی اُن کی تجلّی، یہاں بھی اُن کی ضیا
شہود و غیب کا عالم جدا جدا تو نہیں

ہزار شاہوں سے اچھا ہے ان کے در کا گدا
کہ اُس کے دِل میں غمِ پرسش و سزا تو نہیں

میں سوچتا ہوں کہ دامن وسیع تر کرلوں
کرم کی اُن کے مگر کوئی انتہا تو نہیں

عمل بھی شرط ہے اقبالؔ عشقِ صادق کی
تمہارا فرض فقط مِدحت و ثنا تو نہیں

○

مجھ کو بھی کاش جلوۂ خضرا دکھائی دے
بے نور آنکھ سے بھی اُجالا دکھائی دے

تھوڑی سی دیر کو مجھے بینائی چاہیئے
بس اک جھلک حضورؐ کا روضہ دکھائی دے

یارب عطا ہو مجھ کو وہ مخصوص روشنی
اُٹھے جدھر نگاہ مدینہ دکھائی دے

جاگوں تو صرف اُن کے خیالوں میں گُم رہوں
سو جاؤں تو فقط رُخِ آقاؐ دکھائی دے

منزل مری وہ شہرِ کرامات ہو جہاں
ذرّوں سے آفتاب اُبھرتا دکھائی دے

وہ شہر جس کا نام تو کعبہ نہیں مگر
گلیوں میں جس کی رونقِ کعبہ دکھائی دے

بے نوریٔ نگاہ کا اک فائدہ بھی ہے
کانٹے سُجھائی دیں نہ اندھیرا دکھائی دے

اقبالؔ اپنی چشمِ بصیرت سے کام لو
یہ کیا ضرور آنکھ سے رستہ دکھائی دے

(

مدینے کا سفر ہے اور میں نم دیدہ نم دیدہ
جبیں افسردہ افسردہ، قدم لغزیدہ لغزیدہ

چلا ہوں ایک مجرم کی طرح میں جانبِ طیبہ
نظر شرمندہ شرمندہ، بدن لرزیدہ لرزیدہ

کسی کے ہاتھ نے مجھ کو سہارا دے دیا ورنہ
کہاں میں اور کہاں یہ راستے پیچیدہ پیچیدہ

غلامانِ محمدؐ دور سے پہچانے جاتے ہیں
دلِ گرویدہ گرویدہ، سرِ شوریدہ شوریدہ

کہاں میں اور کہاں اُس روضۂ اقدس کا نظارہ؟
نظر اُس سمت اُٹھتی ہے مگر دزدیدہ دزدیدہ

مدینے جا کے ہم سمجھے تقدّس کس کو کہتے ہیں
ہوا پاکیزہ پاکیزہ، فضا سنجیدہ سنجیدہ

بصارت کھو گئی لیکن بصیرت تو سلامت ہے
مدینہ ہم نے دیکھا ہے مگر نادیدہ نادیدہ

وہی اقبالؔ جس کو ناز تھا کل خوش مزاجی پر
فراقِ طیبہ میں رہتا ہے اب رنجیدہ رنجیدہ

○

نعت میں کیسے کہوں ان کی رِضا سے پہلے
میرے ماتھے پہ پسینہ ہے ثنا سے پہلے

نور کا نام نہ تھا عالمِ امکاں میں کہیں
جلوۂ صاحبِ لَولاکَ لَمَا سے پہلے

اُن کا در وہ درِ دولت ہے جہاں شام و سحر
بھیک مِلتی ہے فقیروں کو صدا سے پہلے

اب یہ عالم ہے کہ دامن کا سنبھلنا ہے محال
کچھ بھی دامن میں نہ تھا اُن کی عطا سے پہلے

تم نہیں جانتے شاید مرے آقاؐ کا مزاج
اُن کے قدموں سے لپٹ جاؤ سزا سے پہلے

چشمِ رحمت سے مِلا اشکِ ندامت کا جواب
مشکل آسان ہوئی قصدِ دعا سے پہلے

اور تو کچھ نہیں مانگا مِرے مولا تجھ سے
اک جھلک روضۂ اقدس کی، قضا سے پہلے

میری آنکھیں مِرا رستہ جو نہ روکیں اقبالؔ
میں مدینے میں مِلوں راہ نما سے پہلے

ہر وقت تصوّر میں مدینے کی گلی ہے
اب دربدری ہے نہ غریب الوطنی ہے

وہ شمعِ حرم جس سے منوّر ہے مدینہ
کعبے کی قسم رونقِ کعبہ بھی وہی ہے

اِس شہر میں بِک جاتے ہیں خود آ کے خریدار
یہ مصر کا بازار نہیں، شہرِ نبیؐ ہے

اِس ارضِ مقدّس پہ ذرا دیکھ کے چلنا
اے قافلے والو یہ مدینے کی گلی ہے

نظروں کو جھکائے ہوئے خاموش گزر جاؤ
بیتاب نگاہی بھی یہاں بے ادبی ہے

حق اِس کا ادا صرف جبینوں سے نہ ہوگا
اے سجدہ گزارو یہ درِ مصطفویؐ ہے

نذرانۂ جاں پیش کرو حلقہ بگوشو!
یہ بارگہِ ہاشمیؐ و مُطَّلَبیؐ ہے

اقبالؔ میں کس منہ سے کروں مدحِ محمدؐ
منہ میرا بہت چھوٹا ہے اور بات بڑی ہے

کہاں میں کہاں مدحِ ذاتِ گرامی، میں سعدی نہ رومی نہ قدسی نہ جامی
پسینے پسینے ہوا جا رہا ہوں، کہاں یہ زباں اور کہاں نامِ نامی

سلام اُس شہنشاہِ کون و مکاں پر، درود اُس امامِ صفِ مرسلاں پر
پیامی تو بے شک سبھی محترم ہیں، مگر اللہ اللہ خصوصی پیامی!

فلک سے زمیں تک ہے جشنِ چراغاں کہ تشریف لاتے ہیں محبوبِ یزداں ﷺ
خوشا جلوۂ ماہتابِ مجسّم، زہے آمدِ آفتابِ تمامی

کوئی ایسا ہادی دکھا دے تو جانیں، کوئی ایسا محسن بتا دے تو مانیں
کبھی دوستوں پر نظر احتسابی، کبھی دشمنوں سے بھی شیریں کلامی

اطاعت پہ اصرار بھی ہر قدم پر، شفاعت کا اقرار بھی ہر نظر میں
اصولاً خطاؤں پہ تنبیہ لیکن مزاجاً خطا کار بندوں کے حامی

یہ آنسو جو آنکھوں سے میری رواں ہیں، عطائے شہنشاہِ کون و مکاں ہیں
مجھے مِل گیا جامِ صہبائے کوثر، مِرے کام آئی مِری تشنہ کامی

فقیروں کو کیا کام طبل و عَلم سے، گداؤں کو کیا فکر جاہ و حشم کی
عباؤں قباؤں کا میں کیا کروں گا، عطا ہو گیا مجھ کو تاجِ غلامی

اُنھیں صدقِ دل سے بُلا کے تو دیکھو، ندامت سے آنسو بہا کے تو دیکھو
لیے جاؤ اقبالؔ نامِ محمدؐ، کہ بخشش کا ضامن ہے اسمِ گرامی

میں اندھیرے میں ہوں، تنویر کہاں سے لاؤں
چشمِ بیدار کی تقدیر کہاں سے لاؤں

خواب میں روضۂ اقدس کا نظارہ تو ہوا
لیکن اس خواب کی تعبیر کہاں سے لاؤں

کیسے سمجھاؤں تمھیں کیا تھے خد و خالِ حضورؐ
پیکرِ نور کی تصویر کہاں سے لاؤں

اُسوۂ پاکِ محمدؐ کا بیاں کیسے کروں
روحِ قرآن کی تفسیر کہاں سے لاؤں

توڑ لاؤں میں ستارے بھی فلک سے لیکن
لوحِ محفوظ کی تحریر کہاں سے لاؤں

بحرِ زخّار کو کوزے میں سمیٹوں کیسے
اتنا جامع فنِ تحریر کہاں سے لاؤں

میں نہ سعدیؔ ہوں، نہ رومیؔ ہوں، نہ جامیؔ، نہ امیرؔ
اپنے لہجے میں وہ تاثیر کہاں سے لاؤں

اپنے افکار کو پابندِ سخن کیسے کروں
میں تو خود قید ہوں، زنجیر کہاں سے لاؤں

میری ہر نعت مرا خونِ جگر ہے لیکن
نعتِ حساؔن کی توقیر کہاں سے لاؤں

نعت میری، مرے اشکوں کی زبانی سُن لو
اس سے بہتر لبِ تقریر کہاں سے لاؤں

میں تو خود اُن کے دَر کا گدا ہوں، اپنے آقاؐ کو میں نذر کیا دوں
اب تو آنکھوں میں بھی کچھ نہیں ہے ورنہ قدموں میں آنکھیں بچھا دوں

آنے والی ہے اُن کی سواری، پھول نعتوں کے گھر گھر سجا دوں
میرے گھر میں اندھیرا بہت ہے، اپنی پلکوں پہ شمعیں جلا دوں

میری جھولی میں کچھ بھی نہیں ہے، میرا سرمایہ ہے تو یہی ہے
اپنی آنکھوں کی چاندی بہا دوں، اپنے ماتھے کا سونا لُٹا دوں

بے نگاہی پہ میری نہ جائیں، دیدہ ور میرے نزدیک آئیں
میں یہیں سے مدینہ دکھا دوں، دیکھنے کا سلیقہ سِکھا دوں

روضۂ پاک پیشِ نظر ہے، سامنے میرے آقاؐ کا دَر ہے
مجھ کو کیا کچھ نظر آ رہا ہے، تم کو لفظوں میں کیسے بتا دوں

میرے آنسو بہت قیمتی ہیں، ان سے وابستہ ہیں ان کی یادیں
ان کی منزل ہے خاکِ مدینہ، یہ گُہر یوں ہی کیسے لُٹا دوں

میں فقط آپؐ کو جانتا ہوں اور اسی دَر کو پہچانتا ہوں
اس اندھیرے میں کس کو پکاروں، آپؐ فرمائیں کس کو صدا دوں

مجھ کو اقبالؔ نسبت ہے اُنؐ سے، جن کا ہر لفظ جانِ سخن ہے
میں جہاں نعت اپنی سُنا دوں، ساری محفل کی محفل جگا دوں

مجھ کو حیرت ہے کہ میں کیسے حرم تک پہنچا
مجھ سا ناچیز درِ شاہِ اُمم تک پہنچا

ماہ و انجم بھی ہیں جس نقشِ قدم سے روشن
آج صد شکر، میں اس نقشِ قدم تک پہنچا

اس کے آگے مری جرأت، نہ تقاضائے ادب
میرا افسانہ فقط دیدۂ نم تک پہنچا

کتنے خوش بخت ہیں ہم لوگ کہ وہ نورِ تمام
اِن اندھیروں میں ہمیں ڈھونڈھ کے ہم تک پہنچا

جرأتِ اشک پہ ندامت ہے مجھے
اتنا گستاخ کہ دامانِ کرم تک پہنچا

اس کو کیا کہتے ہیں اربابِ خرد سے پوچھو
کیسے اک امّی لقب لوح و قلم تک پہنچا

نعت لکھنے کو قلم جب بھی اُٹھایا اقبالؔ
قطرۂ خونِ جگر نوکِ قلم تک پہنچا

○

اللہ اللہ طیبہ و بطحا کی پاکیزہ زمیں
درس گاہِ اہلِ عرفاں، مکتبِ اہلِ یقیں

جلوۂ شمس الضحیٰ، آئینۂ عرشِ بریں
روضۂ بدر الدجیٰ، فردوس بر روئے زمیں

اِس زباں سے آپؐ کی توصیف ممکن ہی نہیں
اے شہنشاہِ اُممؐ اے تاجدارِ مرسلیںؐ

ہر نظر، ہر فکر، ہر انداز، ہر نطقِ حسیں
دل پذیر و دلنواز و دلگداز و دل نشیں

(

موجۂ تسنیم و کوثر کیفِ چشمِ سرمگیں
نکہتِ باغِ جناں خوشبوئے زلفِ عنبریں

ہر تبسم حاصلِ سرمایۂ لوح و قلم
ہر تکلّم حاملِ منشائے ربّ العالمیں

کس تکلّف سے چلی اور کس تقدّس سے بڑھی
ایک شاہانہ سواری جانبِ عرشِ بریں

آگے آگے پیشوائی کے لئے نورِ تمام
پیچھے پیچھے دست بستہ باادب روح الامیں

جستجو لے آئی مجھ کو آج کس کے شہر میں
ذرّے ذرّے پر جُھکی جاتی ہے خود لوحِ جبیں

اک نگاہِ ملتفت کا منتظر ہے دیر سے
اور تو کچھ آپؐ سے اقبالؔ نے مانگا نہیں

یہ خوشبو کچھ مجھے مانوس سی محسوس ہوتی ہے
مجھے تو یہ مدینے کی گلی محسوس ہوتی ہے

یقیناً یہ گزرگاہِ شہنشاہِ دو عالمؐ ہے
فضا میں کس قدر پاکیزگی محسوس ہوتی ہے

مِری بے نور آنکھوں نے چراغوں کی جگہ لے لی
مجھے اب روشنی ہی روشنی محسوس ہوتی ہے

رُکی جاتی ہیں نبضیں اور قدم تھم تھم کے بڑھتے ہیں
مجھے اب قربتِ بابِ نبیؐ محسوس ہوتی ہے

اذانِ صبح دیتا ہے کوئی لحنِ بلالی میں
یکایک روح میں بالیدگی محسوس ہوتی ہے

ہوائیں گنگناتی ہیں، فضائیں مسکراتی ہیں
میں کھویا جا رہا ہوں، بے خودی محسوس ہوتی ہے

جہاں میں اب کھڑا ہوں روضۂ اقدس ہے یہ شاید
تڑپ سینے میں، آنکھوں میں نمی محسوس ہوتی ہے

میں کچھ یوں دم بخود ہوں اس دیارِ رنگ و نکہت میں
کہ اپنی زندگی بھی اجنبی محسوس ہوتی ہے

جبیں میری عرق آلود ہے احساسِ عصیاں سے
بہت خوش ہوں مگر شرمندگی محسوس ہوتی ہے

یہ وہ ارضِ مقدّس ہے جہاں کے ذرّے ذرّے میں
ابھی تک نکہتِ پائے نبیؐ محسوس ہوتی ہے

کہیں بدرالدجیٰؐ کے نور سے فانوس روشن ہیں
کہیں نورالہدیٰؐ کی آگہی محسوس ہوتی ہے

یہ کس کے شہر میں اقبالؔ قسمت مجھ کو لے آئی
یہاں جو چیز ہے کتنی بڑی محسوس ہوتی ہے

○

مدینے کے سارے مکیں محترم ہیں، مدینے کا ایک ایک گھر محترم ہے
کفِ پائے آقاؐ کی خوشبو ہے اِن میں، مدینے کی ہر رہ گزر محترم ہے

وہ نگری ہے اس شاہِ کون و مکاں کی، فقیری کو جس نے امیری عطا کی
امیروں کبیروں پہ کیا منحصر ہے، مدینے کا دریوزہ گر محترم ہے

وہ لوحِ جبیں ہے یقیناً مکرّم، جُھکی ہو کبھی جو حدودِ حرم میں
مُیسر ہوئی ہو جسے دیدِ طیبہ، خدا کی قسم وہ نظر محترم ہے

اُترتی ہے جو نورِ خضرا میں ڈُھل کر مدینے کی وہ شب سراپا تقدّس
جو ہوتی ہے پیدا اذانِ سحر سے وہ طیبہ کی ٹھنڈی سحر محترم ہے

جو آتا ہو اس کو وضو کا سلیقہ، ندامت میں ڈوبے ہوئے آنسوؤں سے
تو سائل کا حرفِ دُعا محترم ہے، دُعا تو دُعا چشمِ تر محترم ہے

وہ ارضِ مقدّس فلک مرتبہ ہے، وہ خاکِ قدم اب بھی خاکِ شفا ہے
مُسافر کے رُتبے کو کیا پُوچھتے ہو، مدینے کی گردِ سفر محترم ہے

جہاں میرے آقاؐ نے ڈالا تھا ڈیرا، دیارِ حرم سے مدینے پہنچ کر
اسے اپنے ہونٹوں سے چُوما ہے میں نے، وہ چھوٹا سا گھر کس قدر محترم ہے

تم اقبالؔ قسمت کے کتنے دھنی ہو کہ آنکھوں کے احسان سے بھی بری ہو
تم اس شہرِ نور الہدیٰ میں کھڑے ہو جہاں زائرِ بے بصر محترم ہے

کیا خبر کیا سزا مجھ کو ملتی، میرے آقاؐ نے عزت بچالی
فردِ عصیاں مِری مجھ سے لے کر، کالی کملی میں اپنی چھپالی

وہ عطا پر عطا کرنے والے اور ہم بھی نہیں ٹلنے والے
جیسی ڈیوڑھی ہے ویسے بھکاری، جیسا داتا ہے ویسے سوالی

میں گدا ہوں مگر کس کے دَر کا؟ وہ جو سلطانِ کون و مکاں ہیں
یہ غلامی بڑی مستند ہے، میرے سر پر ہے تاجِ بلالی

میری عمرِ رواں بس ٹھہر جا، اب سفر کی ضرورت نہیں ہے
ان کے قدموں میں میری جبیں ہے اور ہاتھوں میں روضے کی جالی

اس کو کہتے ہیں بندہ نوازی، نام اس کا ہے رحمت مزاجی
دوستوں پر بھی چشمِ کرم ہے، دشمنوں سے بھی شیریں مقالی

میں مدینے سے کیا آ گیا ہوں، زندگی جیسے بجھ سی گئی ہے
گھر کے اندر فضا سونی سونی، گھر کے باہر سماں خالی خالی

کوئی بادِ مخالف سے کہہ دے، اب مری روشنی مجھ سے چھینے
میں نے آنکھوں کی شمعیں بجھا کر، دل میں طیبہ کی مشعل جلا لی

میں فقط نام لیوا ہوں ان کا، ان کی توصیف میں کیا کروں گا
میں نہ اقبال خسرو، نہ سعدی، نہ قدسی، نہ جامی نہ حالی

سوزِ دل چاہیے، چشمِ نم چاہیے اور شوقِ طلب معتبر چاہیے
ہوں میسّر مدینے کی گلیاں اگر، آنکھ کافی نہیں ہے نظر چاہیے

ان کی محفل کے آداب کچھ اور ہیں، لب کُشائی کی جرأت مناسب نہیں
ان کی سرکار میں التجا کے لئے جنبشِ لب نہیں، چشمِ تر چاہیے

اپنی روُدادِ غم میں سُناؤں کسے، میرے دُکھ کو کوئی اور سمجھے گا کیا؟
جس کی خاکِ قدم بھی ہے خاکِ شفا، میرے زخموں کو وہ چارہ گر چاہیے

رونقیں زندگی کی بہت دیکھ لیں، اب میں آنکھوں کا اپنی کروں گا بھی کیا
اب نہ کچھ دیدنی ہے، نہ کچھ گُفتنی، مجھ کو آقا کی بس اِک نظر چاہیے

میں گدائے درِ شاہِ کونینؐ ہوں، شیش محلوں کی مجھ کو تمنّا نہیں
ہو میسّر زمیں پر کہ زیرِ زمیں، مجھ کو طیبہ میں اک اپنا گھر چاہیئے

ان نئے راستوں کی نئی روشنی ہم کو راس آئی ہے اور نہ راس آئے گی
ہم کو کھوئی ہوئی روشنی چاہیئے، ہم کو آئینِ خیر البشرؐ چاہیئے

گوشہ گوشہ مدینے کا پُرنور ہے، سارا ماحول جلوؤں سے معمور ہے
شرط یہ ہے کہ ظرفِ نظر چاہیئے، دیکھنے کو کوئی دیدہ ور چاہیئے

مدحتِ شاہِ کون و مکاں کے لئے صرف لفظ و بیاں کا سہارا نہ لو
فنِ شعری ہے اقبالؔ اپنی جگہ، نعت کہنے کو خونِ جگر چاہیئے

○

کعبہ مِرے دل میں ہے، مدینہ ہے نظر میں
اب کون سی رونق کی کمی ہے مِرے گھر میں

اس دَر پہ دُعاؤں کی ضرورت نہیں ہوتی
تھوڑا سا سلیقہ ہو اگر دیدۂ تَر میں

اب آنکھوں کو میری کوئی بے نور نہ سمجھے
کچھ جلوے سمٹ آئے ہیں دامانِ نظر میں

ہر گام پہ آنکھوں سے ٹپک جاتے ہیں سجدے
کچھ ایسے مقام آتے ہیں طیبہ کے سفر میں

اس شہر سے سورج بھی گزرتا ہے مودّب
کچھ ایسا تقدّس ہے مدینے کی سحر میں

کعبے میں تو بے شک کوئی بُت اب نہیں موجود
کچھ بُت ابھی باقی ہیں مگر ذہنِ بشر میں

اس راہ کے ہادیؐ کا کہا بھی تو رہے یاد
احرام ہی کافی نہیں کعبے کے سفر میں

مر جاؤں تو اقبالؔ مجھے خلد کے بدلے
تھوڑی سی زمیں چاہیئے آقاؐ کے نگر میں

گو روضۂ اقدس کی طلبگار ہیں آنکھیں
سچ پُوچھو تو خود راہ کی دیوار ہیں آنکھیں

اللہ رے یہ جرأتِ بیتاب نگاہی
بے نور ہیں اور طالبِ دیدار ہیں آنکھیں

یہ بات میں کن لفظوں میں سمجھاؤں کسی کو
اب خواب کے عالم میں بھی بیدار ہیں آنکھیں

ہر رات چلی جاتی ہیں چُپکے سے مدینے
مجھ سے بھی چُھپاتی ہیں، پُراسرار ہیں آنکھیں

یہ سجدے بھی کر لیتی ہیں جب چاہے یہیں سے
دیوانی ہیں لیکن بڑی ہُشیار ہیں آنکھیں

جس شہر میں بِک جاتے ہیں خود جا کے خریدار
اُس شہر میں آوارۂ بازار ہیں آنکھیں

یہ نرگسِ شہلا ہیں گلستانِ حرم کی
یہ کِس نے کہا نرگسِ بیمار ہیں آنکھیں

طیبہ نظر آ جائے تو یہ طاقِ حرم ہیں
طیبہ سے ہوں محروم تو بیکار ہیں آنکھیں

جو نازشِ گنجینۂ کونین ہے اقبالؔ
اُس گوہرِ یکتا کی خریدار ہیں آنکھیں

ہم کو کیا مِل گیا چاندنی سے، ہم کو کیا دے دیا روشنی نے
اپنے یہ چاند سورج سنبھالو، ہم تو جاتے ہیں اپنے مدینے

میں کسی در پہ سر کیوں جُھکا دوں، خالی دامن تمھیں کیوں دکھا دوں
میرے آقا کی نگری سلامت، جس کی گلیوں میں گھر گھر خزینے

ضبط کا مُجھ میں یارا نہیں ہے، رنجِ دوری گوارا نہیں ہے
ذکرِ طیبہ خدارا نہ چھیڑو، پھر چھلک جائیں گے آبگینے

شرم سے سر جُھکے جا رہے ہیں، دل میں رہ رہ کے پچھتا رہے ہیں
اللہ اللہ یہ بارانِ رحمت، آ گئے عاصیوں کو پسینے

علم و عرفاں کا میں کیا کروں گا، درسِ ایماں کسی سے نہ لوں گا
میرے آقاؐ کے قدموں کے نیچے، ہیں فضائل کے لاکھوں دفینے

وہ معطّر معطّر ہوائیں، وہ منوّر منوّر فضائیں
جن کی خوشبو سے معمور سانسیں، جن کے جلووں نے پُرنور سینے

آدمی کا بھرم کھو گیا تھا، غرقِ سیلابِ غم ہو گیا تھا
لیکن اک ناخدا کے سہارے، پھر اُبھر آئے ڈوبے سفینے

عمر اقبالؔ یوں ہی بسر ہو، ہر نفس یادِ خیرالبشرؐ ہو
صبح تا شام ذکرِ مسلسل، اور راتوں کو پیہم شبینے

کعبے کا نور، مسجدِ اقصیٰ کی روشنی
دوگونہ ہوگئی شبِ اسرا کی روشنی

کعبے سے جب چلی تھی سواری حضورؐ کی
تھی شش جہت میں چہرۂ زیبا کی روشنی

جبریلؑ ہم رکاب، جلو میں ملائکہ
اور آگے ئے منزلِ سدرہ کی روشنی

سرچشمۂ معارف و اسرار ہیں حضورؐ
کونین کو محیط ہے اقراء کی روشنی

اُتری جسد میں ڈھل کے رسالت مآبؐ کے
فرشِ زمیں پہ عرشِ معلّٰی کی روشنی

راتوں کو شہرِ طیبہ میں ظلمت کا کیا سوال؟
جلوے بکھیر دیتی ہے خضرا کی روشنی

اک اک گلی مدینے کی ہے رشکِ کہکشاں
اللہ رے نقوشِ کفِ پا کی روشنی

جلوہ گہِ حرم کا تقاضا کچھ اور ہے
کافی نہیں ہے دیدۂ بینا کی روشنی

ہو چکا ہے اک زمانہ کسی رہنما کے ساتھ
ہم ہیں قسم خدا کی فقط مصطفےٰؐ کے ساتھ

منزل پہ ہم نہ پہنچے تو پہنچے گا اور کون؟
ہم جادۂ سفر میں ہیں کس پیشوا کے ساتھ؟

یہ ساری کائنات ہے لولاک آشنا
منسوب ہر چراغ ہے نورالہدیٰؐ کے ساتھ

رشتہ ہر ایک صبح کا شمس الضحیٰؐ سے ہے
ہر شب کو ربطِ خاص ہے بدرالدجیٰؐ کے ساتھ

ممکن نہیں کہ بابِ کرم اس پہ وا نہ ہو
شامل اگر ہو حُسنِ عقیدت دعا کے ساتھ

ہم جانتے ہیں کیا ہے تقاضائے بندگی
صلِّ علیٰ کا ورد بھی ذکرِ خدا کے ساتھ

اقبالؔ نعت گوئی بھی ہے اک شرف مگر
لازم ہے اتباع بھی مدح و ثنا کے ساتھ

مِلا جو اذنِ حضوری پیام بر کے بغیر
میں آگیا درِ اقدس پہ ہم سفر کے بغیر

وفورِ شوق نے یوں میری دست گیری کی
سفر تمام ہوا زحمتِ سفر کے بغیر

انھیں کی چشمِ کرم کا یہ فیض ہے کہ نہیں
نظارہ مجھ کو ہوا منّتِ نظر کے بغیر

ہر اک نفس میں سلام و درُود کی خوشبو
ہر ایک گام پہ سجدہ جبین و سر کے بغیر

حریمِ قدس میں آنکھیں بھی باوضو پہنچیں
ہوئی نہ جرأت اظہارِ چشمِ تر کے بغیر

یہاں کی دھوپ میں ٹھنڈک ہے ابرِ رحمت کی
میں زیرِ سایہ ہوں اور سایۂ شجر کے بغیر

ہر ایک رات ہے اس شہر کی شبِ معراج
زمیں سے تا بہ فلک چاندنی قمر کے بغیر

یہاں کچھ اور ہے اندازِ گردشِ ایّام
فضا ہے نور فشاں آمدِ سحر کے بغیر

میں جانتا ہوں یہ نگری ہے میرے آقاؐ کی
دُعا یہاں سے پلٹتی نہیں اثر کے بغیر

یہاں سے اُٹھ کے میں اقبالؔ کیسے گھر جاؤں
سکونِ قلب مُیسّر ہے مجھ کو گھر کے بغیر

○

سجدے جبیں جبیں ہیں، دُعائیں زباں زباں
سوئے حرم چلے ہیں مُسافر کشاں کشاں

احساسِ معصیت سے ہے لرزاں بدن بدن
اور چشمِ شرمسار سے آنسو رَواں رَواں

طے ہو رہی ہے راہِ طلب یوُں قدم قدم
شاداں عیاں ہیں، پشیماں نہاں نہاں

جلوے فلک فلک ہیں، اُجالے فضا فضا
چمکا ہے آفتابِ رسالت کہاں کہاں

پھوٹی وہیں وہیں سے تجلی کرن کرن
لوحِ جبینِ پاک جُھکی ہے جہاں جہاں

مانو تو ہر صدائے مؤذّن ہے اک پیام
سمجھو تو ہے ندائے محمدؐ اذاں اذاں

گزرے جو ہم مدینے کی گلیوں سے یوں لگا
خوشبو چمن چمن ہے، بہاریں جناں جناں

بیٹھا ہے آستانے پہ اقبالؔ گو خموش
برپا ہے دل میں ایک تلاطم نہاں نہاں

آخری وقت میں کیا رونقِ دنیا دیکھوں
اب تو بس ایک ہی دُھن ہے کہ مدینہ دیکھوں

از افق تا بہ افق ایک ہی جلوہ دیکھوں
جس طرف آنکھ اُٹھے روضۂ والا دیکھوں

عاقبت میری سنور جائے جو طیبہ دیکھوں
دستِ امروز میں آئینۂ فردا دیکھوں

میں کہاں ہوں، یہ سمجھ لوں تو اُٹھاؤں نظریں
دِل ذرا سنبھلے تو میں جانبِ خضرا دیکھوں

جالیاں دیکھوں کہ دیوار و دَر و بامِ حرم
اپنی معذور نگاہوں سے میں کیا کیا دیکھوں

میرے مولا مِری آنکھیں مجھے واپس کردے
تا کہ اِس بار میں جی بھر کے مدینہ دیکھوں

جن گلی کوچوں سے گزرے ہوں کبھی میرے حضورؐ
اُن میں تا حدِّ نظر نقشِ کفِ پا دیکھوں

تا کہ آنکھوں کا بھی احسان اُٹھانا نہ پڑے
قلب خود آئینہ بن جائے میں اتنا دیکھوں

کاش اقبالؔ یوں ہی عمر بسر ہو میری
صبح کعبے میں ہو اور شام کو طیبہ دیکھوں

○

طیبہ جو یاد آیا، آنسو ٹپک گئے ہیں
یہ آبگینے خود ہی اکثر چھلک گئے ہیں

جس جس روش سے گزری سرکارؐ کی سواری
گلشن تو پھر ہیں گلشن، صحرا مہک گئے ہیں

جس سمت اُٹھ گئی ہیں رحمت مزاج نظریں
ماحول کی جبیں سے سجدے ٹپک گئے ہیں

روضے پہ چشمِ تر نے عاصی کی شرم رکھ لی
پلکوں سے کچھ فسانے خود ہی ڈھلک گئے ہیں

غُربت میں ان کا دامن جب یاد آگیا ہے
فکر و نظر کی حد تک جا ئدے چمک گئے ہیں

فریاد اب تو سُن لیں سرکار عاصیوں کی
آہیں بھی تھک گئی ہیں، آنسو بھی تھک گئے ہیں

اے زائرِ مدینہ رستہ نہ بھول جانا
ان منزلوں میں اکثر تقوے بہک گئے ہیں

اقبالؔ صدقِ دل سے یہ نعت کس نے چھیڑی
بے نور انجمن میں جلوے لپک گئے ہیں

میں لب کشا نہیں ہوں اور محوِ التجا ہوں
میں محفلِ حرم کے آداب جانتا ہوں

جو ہیں خدا کے پیارے میں اُن کو چاہتا ہوں
اُن کو اگر نہ چاہوں تو اور کس کو چاہوں

ایسا کوئی مُسافر شاید کہیں نہ ہوگا
دیکھے بغیر اپنی منزل سے آشنا ہوں

کوئی تو آنکھ والا گزرے گا اِس طرف سے
طیبہ کے راستے میں، مَیں مُنتظر کھڑا ہوں

یہ روشنی سی کیا ہے، خوشبو کہاں سے آئی؟
شاید میں چلتے چلتے روضے تک آ گیا ہوں

طیبہ کے سب گداگر پہچانتے ہیں مجھ کو
مجھ کو خبر نہیں تھی میں اِس قدر بڑا ہوں

دُوری و حاضری میں اک بات مُشترک ہے
کچھ خواب دیکھتا تھا، کچھ خواب دیکھتا ہوں

اقبالؔ مجھ کو اب بھی محسوس ہو رہا ہے
روضے کے سامنے ہوں اور نعت پڑھ رہا ہوں

مجھے بھی مِل گئی کچھ خاک آستانے کی
فضا مہک گئی میرے غریب خانے کی

چلا میں گھر سے تو دنیا کے غم بھی ساتھ چلے
نہ گفتگو کی سکت تھی نہ مُسکرانے کی

حدوُدِ طیبہ کا آغاز جس جگہ سے ہوا
وہیں سے لوٹ گئیں گردشیں زمانے کی

قدم قدم پہ جُھکی جا رہی تھی لوحِ جبیں
ہر ایک ذرّے میں خوشبو تھی آستانے کی

جمالِ خضرا میں یوں کھو گیا وجودِ نظر
نہ مِل سکی مجھے فرصت ہی سر جُھکانے کی

مگر حضورؐ کے روضے پہ شرمِ عصیاں سے
نہ ہو سکی مجھے جراُت نظر اُٹھانے کی

کرم تو پہلے بھی اقبالؔ بے شمار ہوئے
مگر یہ خاص نوازش مِرے خدا نے کی

○

کعبے سے اُٹھیں جھوم کے رحمت کی گھٹائیں
مقبول ہوئیں تشنہ نصیبوں کی دعائیں

والشّمس کے جلووں سے منوّر ہیں فضائیں
واللّیل کی خوشبو سے معطّر ہیں ہوائیں

آتی ہے شہنشاہِ شفاعتؐ کی سواری
شاداں ہیں خطاکار تو نازاں ہیں خطائیں

اِس در کے غلاموں کی ہے افتاد فقیری
راس آتی ہیں اُن کو نہ عبائیں نہ قبائیں

ہم حلقہ بگوشانِ درِ مصطفویؐ ہیں
ہم اور کسی در پہ جبیں کیسے جھکائیں

وہ بھی نہ سُنیں گے تو بھلا کون سُنے گا
افسانۂ غم اور کسے جا کے سُنائیں

میں عازمِ طیبہ ہوں مجھے کوئی نہ ٹوکے
کہہ دو کہ حوادث مرے رستے میں نہ آئیں

بس خاکِ کفِ پائے محمدؐ کی طلب ہے
اقبال کا مقصود دوائیں نہ دعائیں

نقابِ شب عروسِ مہر نے چہرے سے سرکائی
شفق پھولی، چمن جاگے، کرن پھوٹی، سحر آئی

ہوا کے نرم جھونکوں سے مہ و انجم کو نیند آئی
نمودِ صبحِ صادق اک پیامِ جانفزا لائی

حریمِ قدس میں محفوظ تھی جو روزِ اوّل سے
وہ نعمت آمنہؓ کی محترم آغوش نے پائی

جنابِ مصطفےٰؐ صلِّ علیٰ تشریف لے آئے
سوادِ طیبہ و بطحا پہ رحمت کی گھٹا چھائی

اجالا ہو گیا ظلمت کدوں میں مہرِ تاباں سے
طلسمِ جہل ٹوٹا، زندگی نے روشنی پائی

بُجھا دیں جس کے ڈر سے بت کدوں نے اپنی قندیلیں
وہ بجلی قہر بن کر کشورِ آزر پہ لہرائی

شعورِ آدمیت جاگ اُٹھا خوابِ غفلت سے
مُیسّر آگئی اک قومِ نابینا کو بینائی

عرب کے ریگزاروں میں کِھلے توحید کے غنچے
وہ کیا آئے زمانے میں بہارِ مستقل آئی

رُخِ پُرنور پر شمس الضحیٰ کی تاب و تابانی
جبینِ پاک پر بدرالدجیٰ کی جلوہ فرمائی

تکلّم حرفِ قدوسی، تبسّم رمزِ لاہوتی
سراپا حُسن و رعنائی، تمامی زیب و زیبائی

بہت جی چاہتا ہے سجدہ کرلوں پائے اقدس پر
شریعت سے مگر مجبور ہے شوقِ جبیں سائی

جہاں روضۂ پاکِ خیرالوریٰ ہے وہ جنّت نہیں ہے تو پھر اور کیا ہے
کہاں میں کہاں یہ مدینے کی گلیاں یہ قسمت نہیں ہے تو پھر اور کیا ہے

محمدؐ کی عظمت کو کیا پوچھتے ہو کہ وہ صاحبِ قابَ قوسین ٹھہرے
بشر کی سرِ عرشِ مہماں نوازی، یہ عظمت نہیں ہے تو پھر اور کیا ہے

جو عاصی کو کملی میں اپنی چھپالے، جو دشمن کو بھی زخم کھاکر دعا دے
اسے اور کیا نام دے گا زمانہ وہ رحمت نہیں ہے تو پھر اور کیا ہے

شفاعت قیامت کی تابع نہیں ہے، یہ چشمہ تو روزِ ازل سے ہے جاری
خطاکار بندوں پہ لطفِ مسلسل شفاعت نہیں ہے تو پھر اور کیا ہے

قیامت کا اک دن معیّن ہے لیکن ہمارے لئے ہر نفس ہے قیامت
مدینے سے ہم جاں نثاروں کی دوری قیامت نہیں ہے تو پھر اور کیا ہے

تم اقبالؔ یہ نعت کہہ تو رہے ہو مگر یہ بھی سوچا کہ کیا کر رہے ہو
کہاں تم کہاں مدحِ ممدوحِ یزداں یہ جرأت نہیں ہے تو پھر اور کیا ہے

ہم مدینے میں تنہا نِکل جائیں گے اور گلیوں میں قصداً بھٹک جائیں گے
ہم وہاں جا کے واپس نہیں آئیں گے، ڈھونڈتے ڈھونڈتے لوگ تھک جائیں گے

قافلوں کو تکلف ہے ہم سے اگر، ہم بھی بےبس نہیں بےسہارا نہیں
خود انھیں کو پکاریں گے ہم دُور سے، راستے میں اگر پاؤں تھک جائیں گے

میری بےنور آنکھوں پہ مت جائیے، رہنمائی کی زحمت نہ فرمائیے
جب اُٹھے گی ادھر وہ نگاہِ کرم، راستے تا بہ منزل چمک جائیں گے

جیسے ہی سبز گنبد نظر آئے گا، بندگی کا قرینہ بدل جائے گا
سر جُھکانے کی فرصت مِلے گی کسے؟ خود ہی پلکوں سے سجدے ٹپک جائیں گے

اے مدینے کے زائر خدا کے لئے داستانِ سفر مجھ کو یوں مت سُنا
بات بڑھ جائے گی، دِل تڑپ جائے گا، میرے محتاط آنسو چھلک جائیں گے

جب چلے گی مدینے سے ٹھنڈی ہوا، گھر کے جب آئے گی اوُدی اوُدی گھٹا
ہر طرف پھول ہی پھول کِھل جائیں گے، بام و دَر نکہتوں سے مہک جائیں گے

نامِ آقاؐ جہاں بھی لیا جائے گا، ذکر ان کا جہاں بھی کیا جائے گا
نور ہی نور سینوں میں بھر جائے گا، ساری محفل میں جلوے لپک جائیں گے

ان کی چشمِ کرم کو ہے اس کی خبر، کس مسافر کو کتنا ہے شوقِ سفر
ہم کو اقبالؔ جب بھی اجازت مِلی، ہم بھی آقاؐ کے دربار تک جائیں گے

○

اللہ اللہ مدینے کی راہیں
جس طرف دیکھیے جلوہ گاہیں

با ادب اے مدینے کے راہی
ہر قدم پر ہیں سَو بارگاہیں

حقِّ سجدہ ادا ہو تو کیسے
ذرّے ذرّے میں ہیں سجدہ گاہیں

جن کے سر پر ہو تاجِ ہلالی
اُن کی ٹھوکر میں شاہی کلاہیں

ہے ادب شرطِ اوّل یہاں کی
لب کشائی نہ شکوے نہ آہیں

حاضرینِ حرم چُپ کھڑے ہیں
التجا کر رہی ہیں نگاہیں

عشقِ احمدؐ کا یہ فیض دیکھو
کھول دیں بابِ رحمت نے باہیں

کب سے اقبالؔ مغرب کی جانب
جانے کیا ڈھونڈتی ہیں نگاہیں

شمعِ بدرالدجیٰ پھر جلا دو
ذرّے ذرّے کو ایمن بنا دو

اک کرن لے کے شمس الضحیٰ کی
میرا ظلمت کدہ جگمگا دو

میرے آقاؐ ! اندھیرا بہت ہے
اب نقاب اپنے رُخ سے ہٹا دو

تم تو نورٌ علیٰ نور ٹھہرے
میری آنکھوں سے پردے اُٹھا دو

صاحبِ قابَ قوسین ہو تم
مجھ کو پرواز کا حوصلہ دو

پھر کبھی کچھ نہ مانگوں گا تم سے
اک جھلک اپنا روضہ دکھا دو

قافلے جا رہے ہیں مدینے
سیرِ طیبہ مجھے بھی کرا دو

میرے تلووں میں چھالے بہت ہیں
میرے رستے سے کانٹے ہٹا دو

میری نیندیں کہیں اُڑ گئی ہیں
اپنے دامن کی مجھ کو ہوا دو

تم کو اقبالؔ آقاؐ نے پوچھا
فردِ عصیاں کو اپنی دعا دو

وہ آستانِ پاک کہاں، میرا سر کہاں
میں اِک بشر کہاں، درِ خیرالبشرؐ کہاں

اِک سیلِ رنگ و نور ہے حدِّ نگاہ تک
وہ جلوہ گاہِ قدس کہاں، یہ نظر کہاں

منشائے شوق اپنی جگہ معتبر سہی
نظّارۂ جمال کی جرأت مگر کہاں

اُن کا خیال، اُن کی ثنا، اُن کا ذکرِ خیر
وارفتگانِ عشق کو اپنی خبر کہاں

اب ہم ہیں اور مدینے کی گلیوں کے روز و شب
اُس در کے سائلوں کا کوئی اور گھر کہاں

کٹنے کو کٹ رہے ہیں شب و روزِ زندگی
لیکن دیارِ پاک کے شام و سحر کہاں

اے سرزمینِ وادیٔ بطحا پناہ دے
چھانیں گے خاک اہلِ وفا دربدر کہاں

ذکرِ رسولؐ صرف مداوا ہے درد کا
ورنہ غمِ جہاں سے کسی کو مفر کہاں

محمدؐ مصطفیٰ صَلِّ علیٰ تشریف لے آئے
زہے قسمت ہمارے پیشوا تشریف لے آئے

اُفق کے گوشے گوشے سے اُجالے کی کرن پھوٹی
طلوعِ صبح ہے، شمس الضحیٰ تشریف لے آئے

عرب کے ریگزاروں میں عجم کی رہ گزاروں میں
چراغاں ہوگیا بدر الدُّجیٰ تشریف لے آئے

اُٹھو اے عاصیو اور بڑھ کے دامن تھام لو اُن کا
زمیں پر شافعِؐ روزِ جزا تشریف لے آئے

مکمّل ہو گیا اب سلسلہ رُشد و ہدایت کا
شہنشاہِ رُسُلؐ نورالہدیٰؐ تشریف لے آئے

مبارک غم کے ماروں کو مبارک خستہ حالوں کو
بالآخر مخزنِؐ جوُد و سخا تشریف لے آئے

پسینہ آگیا بپھری ہوئی موجوں کو ہیبت سے
شکستہ کشتیوں کے ناخدا تشریف لے آئے

مقدّر جاگ اُٹھا اقبالؔ ہم سے بے سہاروں کا
شفیعُ المذنبیں خیرالورا تشریف لے آئے

مِلے، جو مجھ سے کوئی برہمی سے مِلتا ہے
گدائے طیبہ تو مجھ سے خوشی سے مِلتا ہے

میں اس امید پہ آنکھیں بُجھائے بیٹھا ہوں
کہ روشنی کا پتہ تیرگی سے مِلتا ہے

شعورِ زیست کتابوں میں ڈھونڈھنے والو
شعورِ زیست تو عشقِ نبیؐ سے مِلتا ہے

جسے خلوصِ عقیدت کا نام دیتے ہو
وہ خود روی سے نہیں، پیروی سے مِلتا ہے

وہ جانتا ہے کہ تقلیدِ مصطفےٰؐ کیا ہے
جو دوستوں کی طرح اجنبی سے مِلتا ہے

اس آدمی کے مراتب بشر کو کیا معلوم
خدا بھی عرش پہ جس آدمی سے مِلتا ہے

نقوشِ پائے محمدؐ ہوں جس گلی کو نصیب
سُراغِ عظمتِ آدم اسی سے مِلتا ہے

وہ راستہ جو پہنچتا ہے عرش و کرسی تک
براہِ کعبہ انھیں کی گلی سے مِلتا ہے

غزل سرائی سے اقبالؔ وہ کہاں حاصل
سرور و کیف جو ذکرِ نبیؐ سے مِلتا ہے

ہیں محمدؐ مصطفیٰؐ روحِ حیات
اُن کا پیکر مظہرِ انوارِ ذات

اُن کے دم سے رونقِ بزمِ حیات
اُن کی ممنونِ کرم کُل کائنات

اُن سے پُر رونق تمامی ہست و بود
اُن کے قدموں میں نظامِ ممکنات

اُن سے لرزاں کفر و باطل کا غرور
اُن کے آگے سرنگوں لات و منات

اُن کے سر پر ظلِّ سبحانی کا تاج
اُن کے گرد و پیش جلووں کی برات

اُن کی صورت عکسِ قرآنِ مبیں
اُن کی سیرت وحیِ ربِّ کائنات

اُن کی سانسیں نکہتِ باغِ جناں
اُن کی باتیں غیرتِ قند و نبات

اللہ اللہ وہ سفر وہ منزلیں
ساری راتوں سے مقدّس تر وہ رات

سرورِ دین و شہنشاہِ اُمم
ذاتِ پاک مُصطفےٰؐ جانِ حرم

صاحبِ لولاک و روحِ کُن فکاں
نورِ اوّل، حاصلِ لوح و قلم

بر بنائے مصلحت اُمّی لقب
لیکن آگاہِ رموزِ کیف و کم

چشمۂ الطاف ہو جائے رواں
جس طرف اُٹھ جائے وہ چشمِ کرم

اللہ اللہ خواب گاہِ مُصطفےٰؐ
پُر وقار و پُر شکوہ و محتشم

لمحہ لمحہ اُس فضا کا جانفزا
ذرّہ ذرّہ اُس زمیں کا محترم

مِل گیا اقبالؔ دامانِ رسولؐ
فکرِ عقبیٰ ہے نہ اب دنیا کا غم

کرتے ہیں عرضِ حال زبانِ قلم سے ہم
یوں بھیک مانگتے ہیں امامِ اُمم سے ہم

دیکھیں ہماری بات کا مِلتا ہے کیا جواب
بیٹھے ہیں لو لگائے نگاہِ کرم سے ہم

دربارِ مصطفےٰ میں ضروری ہے احتیاط
افسانہ کہہ رہے ہیں فقط چشمِ نم سے ہم

گلدستہ اک سجانا ہے نعتِ رسول کا
کچھ پھول چُن کے لائے ہیں باغِ حرم سے ہم

روکیں ہماری راہ حوادث کی کیا مجال
رکھتے ہیں ربط صاحبِ لوح و قلمؐ سے ہم

لے کر چراغ ہاتھ میں عشقِ رسولؐ کا
مردانہ وار گزرے ہیں راہِ ظُلَم سے ہم

وہ جن کا نام سیّدِ خیرالانام ہے
وابستہ ہیں انھیں کے نقوشِ قدم سے ہم

اقبالؔ ہم کو فکر نہیں روزِ حشر کی
مانوس ہیں مزاجِ شفیعُ الاُمم سے ہم

اے امامِ عارفین و سالکیں
اے امیرِ کاروانِ مرسلیں
اے سفیرِ مالکِ دنیا و دیں
اے سراپا رحمۃ للعالمینؐ

واقفِ اسرارِ حق، دانائے کُل
تاجدارِ انبیا ختمِ رُسُل
راز دارِ خلوتِ عرشِ بریں
اے سراپا رحمۃ للعالمینؐ

ہم گنہگاروں پہ بھی چشمِ کرم
اے شناسائے رموزِ کیف و کم
شافعِ محشر، پناہِ مذنبیں
اے سراپا رحمۃ للعالمینؐ

زندگی ہے مبتلائے تیرگی پھر عطا ہو اس کو نورِ آگہی
جوہرِ آئینۂ علم و یقیں
اے سراپا رحمۃ للعالمینؐ

زہر کی تلخی ہے اب حالات میں دم گھٹا جاتا ہے اِس ظلمات میں
المدد اے سبز گنبد کے مکیں
اے سراپا رحمۃ للعالمینؐ

عطا ہوئی ہے ہمیں اِس لئے پناہِ رسولؐ
کہ ہم ہیں حلقہ بگوشانِ بارگاہِ رسولؐ

ہر ایک ذرّہ وہاں کا ہے واجب التعظیم
گلی گلی ہے مدینے کی شاہراہِ رسولؐ

حرم کے لوگو! حرم کا مقام پہچانو
وہ رہ چکا ہے کبھی خاص سجدہ گاہِ رسولؐ

وہیں وہیں ہے ابھی تک تجلّیوں کا نزول
جہاں جہاں بھی پڑی ہے کبھی نگاہِ رسولؐ

ہم خاکِ مجسّم ہیں مگر خاکِ حرم ہیں
ہم اُن کے ہیں جو ماحصلِ لوح و قلم ہیں

ہم ایک تسلسل ہیں روایاتِ سلف کا
ہم خاک نشیں خالقِ تاریخِ اُمم ہیں

رِضواں سے کہو راہ سے ہٹ جائے ہماری
ہم لوگ غلامانِ درِ شاہِ حرم ہیں

تاجِ سرِ فغفور ہے ٹھوکر میں ہماری
ہم حلقہ بگوشانِ شہنشاہِ اُممؐ ہیں

ورثے میں مِلا ہے ہمیں پندارِ شجاعت
ناموس پہ مر مٹتے ہیں جو لوگ، وہ ہم ہیں

وہ چشمِ خطاپوش مخاطب ہوئی ہم سے
ہم نامۂ اعمال کے ممنونِ کرم ہیں

اقبالؔ ہمیں گردشِ دوراں کا الم کیا
ہم لوگ کہ پروردۂ آغوشِ کرم ہیں

نہ خوابِ جنّت و حور و قصور دیکھا ہے
نہ ہم نے جلوۂ طوبیٰ و طور دیکھا ہے

مگر یہ ناز ہے ہم کو کہ چشمِ باطن سے
ہزار بار مدینہ ضرور دیکھا ہے

وفورِ شوق میں ہم چل پڑے ہیں سوئے حرم
نہ پاس دیکھا ہے ہم نے نہ دوٗر دیکھا ہے

چراغِ طاقِ حرم ہے، حریمِ کعبہ ہے
وہ آنکھ جس نے دیارِ حضورؐ دیکھا ہے

اذانِ صبح میں جب جب سُنا ہے نامِ رسولؐ
زمیں سے تا بہ فلک خطِّ نور دیکھا ہے

خدا کی شان نظر آئی ہم کو قرآں میں
مگر کچھ اور بھی بین السُّطور دیکھا ہے

مدینے جا کے نہ پوچھو کہ ہم نے کیا دیکھا
بس ایک عالمِ صد رنگ و نور دیکھا ہے

خلوصِ دل سے صدا دی ہے جب اُنھیں اقبالؔ
نزولِ رحمتِ ربِّ غفور دیکھا ہے

روز و شب ہم مدحتِ خیر الوریٰ کرتے رہے
حق محبت کا محبّت سے ادا کرتے رہے

اپنی بے نوری پہ بھی شکرِ خدا کرتے رہے
اور یوں تعمیلِ حکمِ مصطفیٰ کرتے رہے

اپنے ہونٹوں پر لگالی ہم نے مُہرِ خامُشی
اور اشکوں کی زباں سے التجا کرتے رہے

اپنی اِس جرأت پہ ہم کو ناز تھا اور ناز ہے
اُن کو اپنا جان کر اُن سے گلہ کرتے رہے

ہم نے آدابِ محبت کا کیا یوں احترام
دل ہی دل میں اُن سے عرضِ مدّعا کرتے رہے

یہ جبیں اُس آستانِ پاک کے قابل نہ تھی
آنکھوں ہی آنکھوں میں ہم سجدے ادا کرتے رہے

کاش طیبہ میں میسر ہو ہمیں دو گز زمیں
زندگی بھر ہم خدا سے یہ دعا کرتے رہے

مختصر یہ ہے کہ ہم اقبال ساری زندگی
ہر نفس پر شرحِ تسلیم و رضا کرتے رہے

اے مہِ نورِ ازل، اے شہِ لولاک قدم
چل کے آیا ہے بڑی دور سے محتاجِ کرم

اپنی پلکوں پہ جلائے ہوئے طیبہ کے چراغ
اپنی سانسوں میں بسائے ہوئے خوشبوئے حرم

اپنے ماتھے پہ سجائے ہوئے سجدوں کا خلوص
اپنے ہاتھوں میں لیے حُسنِ عقیدت کا علَم

اپنے سینے میں چھُپائے ہوئے شرمِ عصیاں
اپنے کاندھوں پہ اُٹھائے ہوئے کہسارِ الم

میری معراجِ نظر گنبدِ خضرا کا جمال
میرا مقصودِ سفر آپؐ کا دامانِ کرم

یہ نہیں ہے کہ میں محرومِ کرم ہوں لیکن
مخزنِ جود و سخا اور کرم اور کرم

آپؐ کی مدح کا حق مجھ سے ادا ہو کیسے؟
میرے قابو میں نہ الفاظ نہ لہجہ نہ قلم

اے مہِ برجِ صفا، مہرِ جہاں تابِ حرا
رہروِ سدرہ نفس، راکبِ معراج قدم

وجہِ تکوینِ جہاں و باعثِ تحریکِ زماں
حاصلِ لوح و قلم، خالقِ تاریخِ اُمم

پیکرِ صدق و صفا، آئینۂ صبر و رضا
مصدرِ مہر و وفا، معدنِ الطاف و نعم

آپؐ کی ذاتِ قدس دونوں جہانوں کو محیط
ربِّ کعبہ کی قسم، عرشِ مُعلّٰی کی قسم

میرے آقاؐ اپنے دل کا حال میں کس سے کہوں
چُپ رہوں لیکن کہاں تک اور کیسے چُپ رہوں

رات کو نیندیں میسر ہیں نہ اب دن کو سکوں
اور ہوتا جا رہا ہے دردِ مہجوری فزوں

صبر کا دامن چُھٹا جاتا ہے ہاتھوں سے مِرے
آپ خود فرمائیں آخر میں کروں تو کیا کروں

صرف اِتنا عرض کرنے کی اجازت ہو عطا
دور رہ کر آپ کے قدموں سے، میں کیونکر جیوں

کچھ سجدے مدینے کے لئے کیوں نہ بچالیں
اُس اَرضِ مُقدّس کو جبینوں میں بسالیں

قسمت سے مُیسر ہو اگر خاکِ مدینہ
اُس خاک کے ہر ذرّے کو پلکوں سے اُٹھالیں

کانٹے بھی نظر آئیں اگر دشتِ حرم کے
اُن کانٹوں کو پھولوں کی طرح گھر میں سجالیں

اب میرے گناہوں کو اماں اور کہاں ہے؟
آقاؐ انھیں آپ اپنے ہی دامن میں چُھپالیں!

گزریں جو ادھر سے کبھی طیبہ کی ہوائیں
ہر سانس کو ہم زندۂ جاوید بنالیں

اقبالؔ کا دنیا میں کوئی اور نہیں ہے
ممکن ہے یہی سوچ کے سرکارؐ بلالیں

○

مجھ سے مِری خطاؤں کی لذّت، نہ پوچھیے
کیف و سرورِ اشکِ ندامت، نہ پوچھیے

میں کر رہا ہوں جرأتِ توصیفِ مُصطفیٰؐ
اِس وقت کیا ہے قلب کی حالت، نہ پوچھیے

کس درجہ خوش نصیب ہیں کس درجہ شادکام
وابستگانِ دامنِ دولت، نہ پوچھیے

مجھ پر کرم ہوئے ہیں خطاؤں کے باوجود
کیا کیا ہوئی ہے مجھ کو ندامت، نہ پوچھیے

ہر ہر قدم پہ یادِ مدینہ ہے ہم سفر
آسودگیٔ عالمِ غربت، نہ پوچھیے

میں خاکِ پائے خادمِ خیرالانامؐ ہوں
مجھ سے مِرے مراتبِ نسبت، نہ پوچھیے

جو سر وہاں جُھکا وہ سرافراز ہو گیا
اُس بارگاہِ قدس کی عظمت، نہ پوچھیے

اقبالؔ ساری بزم ہے خوشبو سے گل کدہ
نعتِ نبیؐ کا حُسنِ کرامت، نہ پوچھیے

ہوا جلوہ فرما نگارِ مدینہ
دُلھن بن گیا ہے دیارِ مدینہ

معطّر معطّر ، منوّر منوّر
خوشا یادِ قرب و جوارِ مدینہ

کوئی نقش، نقشِ تمنّا نہیں ہے
نگاہوں میں ہے شاہکارِ مدینہ

ہوئے سر بہ سجدہ بتانِ مجازی
بڑھا جس طرف شہریارِ مدینہ

شہنشاہِ شاہانِ عالی مراتب
گدائے درِ تاجدارِ مدینہ

ہیں اپنی جگہ خلد و فردوس لیکن
دیارِ مدینہ، دیارِ مدینہ!!

کوئی مجھ سے پوچھے میں کیا چاہتا ہوں
فقط ایک مشتِ غبارِ مدینہ

سراپا عقیدت ہے اقبالؔ، یعنی
فدائے حرم، جاں نثارِ مدینہ

غم سے آزاد کیا عشقِ نبیؐ نے ہم کو
خود بخود آگئے جینے کے قرینے ہم کو

روح بے تاب ہے سینے سے نکلنے کے لئے
کس محبّت سے صدا دی ہے کسی نے ہم کو

اب مدینے کے سوا کوئی ٹھکانا ہی نہیں
یہ سکھایا ہے غریب الوطنی نے ہم کو

تشنہ کامانِ محمدؐ میں ہیں ہم بھی شامل
حقِّ تسنیم دیا تشنہ لبی نے ہم کو

ایک عاصی آج ہوتا ہے ثنا خوانِ رسولؐ
دیکھیں کیا صادر ہو اُس کے حق میں فرمانِ رسولؐ

چند آنسو، چند نعتیں، چند گلہائے درود
لے کے آئے ہیں یہ نذرانے گدایانِ رسولؐ

اپنی فردِ جرم ہاتھوں میں لیے با چشمِ نم
سوئے طیبہ جا رہے ہیں پا بجولانِ رسولؐ

آج دربارِ حرم میں بٹ رہے ہیں کچھ خطاب
سامنے رکھی ہے فہرستِ غلامانِ رسولؐ

شرط یہ ہے، اِس میں شامل ہو ندامت کا خلوص
ایک آنسو بھی بہت ہے، شرمسارانِ رسولؐ!

اب تو اِس چوکھٹ سے مر کر ہی اُٹھیں گے ایک دن
اب کہاں جاتے ہیں ہم حلقہ بگوشانِ رسولؐ

کیا عجب تم پر بھی پڑ جائے نگاہِ التفات
تم بھی بڑھ کر تھام لو اقبالؔ دامانِ رسولؐ

فلک سے درود و سلام آ رہا ہے
زباں پر محمدؐ کا نام آ رہا ہے

میسّر ہوا جس کو قربِ الٰہی
زمیں پر وہ عالی مقام آ رہا ہے

اُتر کر حرا سے خدا کا پیامی
لیے زندگی کا پیام آ رہا ہے

اِسے صرف شمعِ ہدایت نہ سمجھو
مجسّم خدا کا کلام آ رہا ہے

ملیں گی عجم کو بھی جس سے ضیائیں
عرب کا وہ ماہِ تمام آ رہا ہے

جو دستورِ آخر، عطائے نبیؐ ہے
وہ اب تک زمانے کے کام آ رہا ہے

شفاعت کی اِس کو سند میں سمجھ لوں
وہ کہہ دیں کہ میرا غلام آ رہا ہے

○

سرِ شام گنبدِ سبز تک جو با احترام نظر گئی
تمھیں کیا بتاؤں جو اس گھڑی دلِ مضطرب پہ گزر گئی

جو تجلّیوں کا نزول تھا، مِری روح میں وہ سما گیا
جو فضا میں نکہتِ خاص تھی وہ مشامِ جاں تک اُتر گئی

جو تمام نکہت و نور ہے، مجھے اس دیار میں یوں لگا
کہ سواری میرے حضورؐ کی ابھی اس طرف سے گزر گئی

میں درِ رسولؐ تک آ گیا، مجھے اور کچھ نہیں چاہیے
مِری آنکھ بجھ بھی گئی تو کیا، مِری زندگی تو سنور گئی

مجھے مِل گئیں مری منزلیں، کبھی یہ حرم، کبھی وہ حرم
کوئی روشنی مِرے ساتھ تھی، میں جدھر گیا، وہ اُدھر گئی

مِرے قافلے نے ستم کیا، مجھے آستاں سے اُٹھا لیا
وہ سکونِ قلب و نظر گیا، وہ بہارِ شام و سحر گئی

یہ جسد ہے میرا جو گھر میں ہے، مِری روح اب کہیں اور ہے
مِری بات اس نے نہیں سُنی، وہ حجاز ہی میں ٹھہر گئی

○

اک مسافر بعدِ تکمیلِ سفر واپس ہوا
کر کے دیدارِ درِ خیر البشرؐ واپس ہوا

جو فقط اُس جیسے خوش بختوں کو ہوتی ہے نصیب
دیکھ کر آنکھوں سے وہ شام و سحر واپس ہوا

جن کو حاصل رہ چکا ہے مدّتوں قربِ رسولؐ
چوم کر ہونٹوں سے وہ دیوار و در واپس ہوا

جس کے ہاتھوں میں نے بھیجا تھا وہاں اپنا سلام
اُن کے در سے میرا وہ پیغامبر واپس ہوا

اُس کو سینے سے لگا لوں اُس کی آنکھیں چوم لوں
جو دیارِ مصطفیٰؐ کو دیکھ کر واپس ہوا

پیاس دیدارِ حرم کی بُجھ کے بھی بُجھتی نہیں
تشنہ لب گھر سے چلا اور تشنہ تر واپس ہوا

اُن کو کیا معلوم اُس کی روح ہے اب تک وہیں
لوگ کہتے ہیں مسافر اپنے گھر واپس ہوا

اُس کو اب سجدہ کرے گی گردشِ لیل و نہار
جو دیارِ پاک سے سینہ سپر واپس ہوا

حجِّ بیت اللہ کے رسمی سفر سے فائدہ ؟
زائرو! نظّارۂ دیوار و در سے فائدہ ؟

تم سے جب ممکن نہیں تعمیلِ ارشادِ رسولؐ
مومنو! طوفِ درِ خیر البشرؐ سے فائدہ ؟

قبلِ آغازِ سفر تقریبِ رخصت کیا ضرور؟
بعدِ تکمیلِ سفر بھی کرّ و فر سے فائدہ ؟

قلب میں پیدا نہ ہو جب تک سُرورِ سرمدی
خود ہی سوچو صرف تسکینِ نظر سے فائدہ ؟

راستے بھول گئے بانگِ دِرا بھول گئے
قافلے مشورۂ راہ نما بھول گئے

ایسے نادان مسافر کہیں دیکھے نہ سُنے
اپنی سمجھی ہوئی منزل کا پتہ بھول گئے

داعیٔ حق ﷺ کو یہ شکوہ ہے حرم والوں سے
جاں نثارانِ وفا عہدِ وفا بھول گئے

ہم یہ کہتے ہیں کہ بندے ہیں خدا کے، لیکن
کیا ہے فرمودۂ محبوبِ خدا ﷺ بھول گئے

عیشِ دوراں نے کیا ہم کو خدا سے غافل
کیا ہے اس جرمِ تغافل کی سزا بھول گئے

اپنی تقدیر کو الزام دیے جاتے ہیں
اور اِس فکر میں ہم اپنی خطا بھول گئے

ایسے کھوئے گئے ہم حرص و ہوا میں اقبالؔ
مسلک و شیوۂ تسلیم و رِضا بھول گئے

○

سوئے ہوئے زخموں کو جگا کیوں نہیں دیتے
اے اہلِ وفا دادِ جفا کیوں نہیں دیتے

پیغامِ مساوات سُنا کیوں نہیں دیتے
یہ فرقِ من و تو کا مٹا کیوں نہیں دیتے

دیوار کا یہ عذر سُنا جائے گا کب تک
دیوار اگر ہے تو گرا کیوں نہیں دیتے

فرزانوں کو جینے کا سلیقہ نہیں آتا
آدابِ جنوں اُن کو سکھا کیوں نہیں دیتے

تم کو نہیں معلوم تو تاریخ سے پوچھو
تم کون ہو دنیا کو بتا کیوں نہیں دیتے

توبہ کا یہی وقت ہے کیا سوچ رہے ہو
سجدے میں جبینوں کو جھکا کیوں نہیں دیتے

کمزور سہاروں کا کوئی ٹھیک نہیں ہے
تم ہادیٔ برحقؐ کو صدا کیوں نہیں دیتے

○

دلوں کی جوت جگا دو کہ روشنی ہو جائے
بجھے چراغ جلا دو کہ روشنی ہو جائے

تمھارے پاس اگر اب بھی کچھ تبسّم ہیں
انھیں لبوں پہ سجا دو کہ روشنی ہو جائے

تم اپنے گھر میں جو خوشیاں چھپائے بیٹھے ہو
وہ غم کدوں میں لٹا دو کہ روشنی ہو جائے

جو زخم سینوں میں روشن ہیں ایک مدّت سے
وہ زخم سب کو دکھا دو کہ روشنی ہو جائے

اگر چراغ بھی روشن نہ کر سکیں گھر کو
تو گھر میں آگ لگا دو کہ روشنی ہو جائے

تمھارے بس میں اگر اور کچھ نہ ہو اقبالؔ
تو ایک نعت سُنا دو کہ روشنی ہو جائے

بصد ادب شہِ کونینؐ سے یہ عرض کرو
چراغِ طور جلا دو کہ روشنی ہو جائے

اب انتظارِ سحر کی کسی میں تاب نہیں
نقاب رُخ سے اُٹھا دو کہ روشنی ہو جائے

○

صد شکر، اتنا ظرف مِری چشمِ تر میں ہے
دیکھے بغیر سارا مدینہ نظر میں ہے

پہلا سفر مدینے کا میں کیسے بھول جاؤں
سارا وجود میرا ابھی تک سفر میں ہے

لفظوں کے بس کی بات نہیں اس کا تجزیہ
کچھ ایسا کیف طیبہ کی شام و سحر میں ہے

ہے جلوہ پاش گنبدِ خضرا کچھ اس طرح
فیضانِ نور شہر کے ہر بام و در میں ہے

صدیاں ہوئیں حضورؐ کو پردہ کیے مگر
خوشبو خرامِ پاک کی ہر رہگزر میں ہے

تھوڑی سی خاکِ پاکِ مدینہ ہے میرے پاس
نازاں ہوں میں کہ دولتِ کونین گھر میں ہے

کیا ہوگا وہ وقار کسی تاجدار میں
اقبالؔ جو مدینے کے دریوزہ گر میں ہے

سارے نبیوں کے عہدے بڑے ہیں لیکن آقا کا منصب جدا ہے
وہ امامِ صفِ انبیاء ہیں، اُن کا رُتبہ بڑوں سے بڑا ہے

کوئی لفظوں سے کیسے بتادے، اُن کے رُتبے کی حد ہے تو کیا ہے
ہم نے اپنے بڑوں سے سُنا ہے، صرف اللہ اُن سے بڑا ہے

وہ جو اک شہرِ نورالہدیٰ ہے، جلوہ گاہوں کا اِک سلسلہ ہے
جس کی ہر صبح شمس الضحیٰ ہے، جس کی ہر شام بدرالدجیٰ ہے

نامِ جنت کا تم نے سُنا ہے، میں نے اس کا نظارہ کیا ہے
میں یہاں سے تمھیں کیا بتادوں، ان کی نگری کی گلیوں میں کیا ہے

کتنا پیارا ہے موسم وہاں کا، کتنی پُرکیف ساری فضا ہے
تم مرے ساتھ خود چل کے دیکھو، گردِ طیبہ بھی خاکِ شفا ہے

یہ وہی شہرِ طیبہ ہے جس میں خواب گاہِ حبیبِ خدا ہے
کام ہے جن کا عقدہ کُشائی، نام بھی جن کا خیرالوریٰ ہے

جن کا رُتبہ سِوا سے سِوا ہے، فہم و ادراک سے ماورا ہے
بحر و بر جن کے زیرِ نگیں ہیں، تا بہ افلاک جن کی ضیا ہے

پیشواؤں کے جو پیشوا ہیں، اِک لقب جن کا صدرالعلا ہے
قابَ قوسَین ہے جن کی منزل، رہگزر سدرۃ المنتہیٰ ہے

مُستقل اُن کی ڈیوڑھی عطا ہو، میرے معبود یہ التجا ہے
کوئی پُوچھے تو یہ کہہ سکوں میں، بابِ جبریل میرا پتہ ہے

جو تمھیں بھی میری طرح کہیں نہ سکونِ قلب نصیب ہو
مِری بات مانو تو میں کہوں مِرے ساتھ سُوئے حرم چلو

تمھیں ہم سفر کی ہے جُستجو، مجھے راہبر کی تلاش ہے
چلو ایک ساتھ چلے چلیں، مِرا ہاتھ ہاتھ میں تھام لو

وہ جو گھر ہے میرے حضورؐ کا، وہ جو دَر ہے نکہت و نور کا
اسی آستاں پہ پڑے رہو، اسی دَر پہ عمر گزار دو

کبھی پیش آئیں جو مسئلے، کبھی سر اُٹھائیں جو مرحلے
کوئی اور کام نہ آئے گا جو صدائیں دو تو انھیں کو دو

جو دوا بھی ہیں، جو شفا بھی ہیں، جو شفیعِ روزِ جزا بھی ہیں
جنھیں جانِ لُطف و عطا کہو، جنھیں عینِ جود و سخا کہو

وہی غم زدوں کے کفیل ہیں، وہی عاصیوں کے وکیل ہیں
وہی مغفرت کی سبیل ہیں، بس اُنھیں کا ذکر کیا کرو

وہ بڑے رؤف و رحیم ہیں، وہ حبیبِ ربِّ کریم ہیں
خود انھیں سے حال بیاں کرو، مرے واسطے بھی دُعا کرو

جو تمھارا بخت نہ ساتھ دے، جو سفر کا حکم نہ مل سکے
تو بصد خلوص و سپردگی شب و روز نعت پڑھا کرو

مگر ایک بات نہ بھولنا کہ حضورؐ کس کے حبیب ہیں
کبھی وردِ صَلِّ علیٰ کرو، کبھی ذکرِ ربُّ العلیٰ کرو

○

جلوہ فگن محمدؐ، جلوہ نما محمدؐ
خود عکسِ آئینہ گر، خود آئینہ محمدؐ

صبحِ ازل بھی ان کی شامِ ابد بھی ان کی
شمس الضحےٰ محمدؐ، بدرالدجیٰ محمدؐ

تہذیبِ سالکاں بھی، تادیبِ گمرہاں بھی
ہر جادۂ سفر میں نور الہدیٰ محمدؐ

ان کو خلوصِ دل سے کوئی اگر پکارے
مشکل کی ہر گھڑی میں مشکل کشا محمدؐ

تائیدِ بے نوایاں، تسکینِ غم نصیباں
غمخوار و غمگسار و غم آشنا محمدؐ

ہر طالبِ شفا کا دارالشفا مدینہ
ہر دردِ لادوا کی شافی دوا محمدؐ

اپنے پرائے سب کے عقدہ کشا وہی ہیں
خیر الامم محمدؐ، خیر الوریٰ محمدؐ

محفوظ کشتیوں کے تو ناخدا سبھی ہیں
ٹوٹے ہوئے سفینوں کے ناخدا محمدؐ

قرآن بولتا تھا لہجے میں مصطفیٰؐ کے
ہوتے تھے جب ہدایت کو لب کشا محمدؐ

ہر ملک اور ملت کا کوئی پیشوا ہے
اور سارے پیشواؤں کے پیشوا محمدؐ

اقبالؔ حرزِ جاں ہے اب صرف یہ وظیفہ
صلِّ علیٰ محمدؐ، صلِّ علیٰ محمدؐ

بیان کیسے ہوں الفاظ میں صفات اُن کی
نزولِ وحیِ الٰہی ہے بات بات اُن کی

اُنھی کے دَم سے منور ہے بزمِ کون و مکاں
زمیں سے تا بہ فلک ساری کائنات اُن کی

وجودِ پیکرِ خاکی میں نورِ لاہوتی
کمالِ خالقِ کون و مکاں ہے ذات اُن کی

جو اُن کے ہو گئے اُن کے نصیب کیا کہنا
حیات اُن کی، ممات اُن کی کائنات اُن کی

ولی، مجیب و رؤف و رحیم و حق و کریم
صفاتِ خالقِ کونین ہیں صفات اُن کی

تمام طاعت وتقویٰ تمام صدق وصفا
کلامِ پاک کی تفسیر ہے حیات اُن کی

جنھیں نواز دے دامانِ رحمتِ عالم
بیک نگاہِ شفاعت اثر نجات اُن کی

سجود فرض ہیں اظہارِ بندگی کے لئے
درود شرط ہے ذکرِ محمدیؐ کے لئے

کوئی کسی کے لئے ہے، کوئی کسی کے لئے
مگر حضورؐ کی سرکار ہے سبھی کے لئے

خطابِ رحمتِ عالم ہے وہ خطابِ جلیل
بجز حضورؐ جو زیبا نہیں کسی کے لئے

کوئی رسول رؤف و رحیم ہے نہ کریم
خدا کے نام ہیں مختص حضورؐ ہی کے لئے

لباسِ فقر میں بھی سروری ہے اُن کی غلام
کہ تاج و تخت ضروری نہیں نبیؐ کے لئے

مدینہ جا کے نہ لوٹے کوئی تو کیا کہنا
بڑے شرف کی یہ منزل ہے زندگی کے لئے

جہاں شکستہ دِلوں کو سکون مِلتا ہے
تڑپ رہا ہوں میں اُس دَر کی حاضری کے لئے

جو خاکِ پاکِ مدینہ عطا ہوئی ہے مجھے
وہ ساتھ جائے گی تُربت میں روشنی کے لئے

ہر اک رسول کا محدود اک علاقہ تھا
حضورؐ آئے دو عالم کی رہبری کے لئے

○

عنوانِ کتابِ آفرینش
سرمایۂ کن فکاں محمدؐ

تکمیلِ صحیفۂ رسالت
سرخیلِ پیمبراں محمدؐ

سرتاجِ قلمروِ فضیلت
شاہنشہِ فاضلاں محمدؐ

دانائے رموزِ ہر دو عالم
دانش گہِ عارفاں محمدؐ

قاموسِ معارف و معانی
سرچشمۂ کاملاں محمدؐ

درویش و فقیرِ ربِّ کعبہ
ظِلّ اللہ خسرواں محمدؐ

ذی رُتبہ و مُنکسر طبیعت
ہم بندہ و حکمراں محمدؐ

شہکارِ کمالِ حضرتِ حق
اُمّی و علوم داں محمدؐ

گہوارۂ شکستگانِ ہستی
منزل گہِ عاصیاں محمدؐ

تالیفِ قلوبِ غم نصیباں
تسکین و قرارِ جاں محمدؐ

ذاتے کہ تمامتر تقدس
نامے کہ بدوں گماں محمدؐ

اِس شان سے ہو کاش تماشائے مدینہ
جس سمت نظر جائے، نظر آئے مدینہ

سودا ہو اگر سر میں تو سودائے مدینہ
ہو دِل میں تمنّا تو تمنائے مدینہ

ہر وقت تصوّر میں مدینے کی فضا ہو
اِس طرح مِرے دِل میں سما جائے مدینہ

ہر خار مدینے کا گُلِ تر سے حسیں تر
اور غیرتِ فردوس ہے صحرائے مدینہ

ہے شافعِ محشر کا کرم اُس کا مقدّر
اللہ رے خوش بختیِ شیدائے مدینہ

تخلیقِ دو عالم کا سبب ذات ہے اُن کی
شاہنشۂ کونین ہیں آقائے مدینہ

خاکِ قدمِ پاکِ نبیؐ خاکِ شفا ہے
ہر دَور کا درماں ہیں مسیحائے مدینہ

وہ کوثر و تسنیم کا محتاج نہیں ہے
ہو جس کو عطا جُرعۂ صہبائے مدینہ

یاد آتے ہیں جس وقت مدینے کے شب و روز
اقبالؔ پُکار اُٹھتا ہوں میں ہائے مدینہ

○

مالکِ کون و مکاں خود ہے ثنا خوانِ رسولؐ
اس سے بہتر ان کی مدحت اور کر سکتا ہے کون

عظمتِ آقا کے یوں تو معترف ہیں غیر بھی
مستند توثیقِ عظمت اور کر سکتا ہے کون

دِل پہ جب قابو نہ ہو تو نعت گو بھی کیا کرے
ورنہ مدحت کی جسارت اور کر سکتا ہے کون

جُز شفیعِ روزِ محشر، حضرتِ حق کے حضور
گُنہگاروں کی شفاعت اور کر سکتا ہے کون

یہ شرف مختص ہے بس خیر الوریٰ کے واسطے
عاصیوں پر یوں عنایت اور کر سکتا ہے کون

آپ سرخیلِ رسل، خیر البشر خیر الامم
سارے نبیوں کی وکالت اور کر سکتا ہے کون

اللہ اللہ یہ کرم یہ درگزر یہ حوصلہ
خون کے پیاسوں پہ رحمت اور کر سکتا ہے کون

خانۂ دشمن بھی ٹھہرا ضامنِ حفظ و اماں
یہ مروّت یہ شرافت اور کر سکتا ہے کون

ہر نفس رب کی ثنا اور ہر قدم اُس کی رضا
یوں ادا فرضِ عبادت اور کر سکتا ہے کون

جوئے خوں بھی سر سے گزری، خونِ ناحق بھی ہُوا
دینِ حق کی یوں حفاظت اور کر سکتا ہے کون

○

مدینے کے سارے مکیں محترم ہیں، مدینے کا ایک ایک گھر محترم ہے
کفِ پائے آقاؐ کی خوشبو ہے اِن میں، مدینے کی ہر رہ گزر محترم ہے

وہ نگری ہے اس شاہِ کون و مکاں کی، فقیری کو جس نے امیری عطا کی
امیروں کبیروں پہ کیا منحصر ہے، مدینے کا دریوزہ گر محترم ہے

وہ لوحِ جبیں ہے یقیناً مکرّم، جُھکی ہو کبھی جو حدودِ حرم میں
مُیسّر ہوئی ہو جسے دیدِ طیبہ، خدا کی قسم وہ نظر محترم ہے

اُترتی ہے جو نورِ خضرا میں ڈُھل کر مدینے کی وہ شب سراپا تقدّس
جو ہوتی ہے پیدا اذانِ سحر سے وہ طیبہ کی ٹھنڈی سحر محترم ہے

جو آتا ہو اس کو وضو کا سلیقہ، ندامت میں ڈوبے ہوئے آنسوؤں سے
تو سائل کا حرفِ دُعا محترم ہے، دُعا تو دُعا چشمِ تَر محترم ہے

وہ ارضِ مقدّس فلک مرتبہ ہے، وہ خاکِ قدم اب بھی خاکِ شفا ہے
مُسافر کے رُتبے کو کیا پُوچھتے ہو، مدینے کی گردِ سفر محترم ہے

جہاں میرے آقاؐ نے ڈالا تھا ڈیرا، دیارِ حرم سے مدینے پہنچ کر
اسے اپنے ہونٹوں سے چُوما ہے میں نے، وہ چھوٹا سا گھر کسقدر محترم ہے

تم اقبالؔ قسمت کے کتنے دھنی ہو کہ آنکھوں کے احسان سے بھی بَری ہو
تم اس شہرِ نورالہدیٰؐ میں کھڑے ہو جہاں زائرِ بے بصر محترم ہے

کیا خبر کیا سزا مجھ کو ملتی، میرے آقاؐ نے عزّت بچالی
فردِ عصیاں مری مجھ سے لے کر، کالی کملی میں اپنی چھپالی

وہ عطا پر عطا کرنے والے اور ہم بھی نہیں ٹلنے والے
جیسی ڈیوڑھی ہے ویسے بھکاری، جیسا داتا ہے ویسے سوالی

میں گدا ہوں مگر کس کے دَر کا؟ وہ جو سلطانِ کون و مکاں ہیں
یہ غلامی بڑی مستند ہے، میرے سر پر ہے تاجِ بلالی

میری عمرِ رواں بس ٹھہر جا، اب سفر کی ضرورت نہیں ہے
ان کے قدموں میں میری جبیں ہے اور ہاتھوں میں روضے کی جالی

اس کو کہتے ہیں بندہ نوازی، نام اس کا ہے رحمت مزاجی
دوستوں پر بھی چشمِ کرم ہے، دشمنوں سے بھی شیریں مقالی

میں مدینے سے کیا آ گیا ہوں، زندگی جیسے بجھ سی گئی ہے
گھر کے اندر فضا سونی سونی، گھر کے باہر سماں خالی خالی

کوئی بادِ مخالف سے کہہ دے، اب مری روشنی مجھ سے چھینے
میں نے آنکھوں کی شمعیں بُجھا کر، دِل میں طیبہ کی مشعل جلا لی

میں فقط نام لیوا ہوں ان کا، ان کی توصیف میں کیا کروں گا
میں نہ اقبالؔ خسروؔ، نہ سعدیؔ، میں نہ قدسیؔ نہ جامیؔ، نہ حالیؔ

○

سوزِ دل چاہیے، چشمِ نم چاہیے اور شوقِ طلب معتبر چاہیے
ہوں میسّر مدینے کی گلیاں اگر، آنکھ کافی نہیں ہے نظر چاہیے

ان کی محفل کے آداب کچھ اور ہیں، لب کُشائی کی جرأت مناسب نہیں
ان کی سرکار میں التجا کے لئے جنبشِ لب نہیں، چشمِ تر چاہیے

اپنی رُودادِ غم میں سُناؤں کسے، میرے دُکھ کو کوئی اور سمجھے گا کیا؟
جس کی خاکِ قدم بھی ہے خاکِ شفا، میرے زخموں کو وہ چارہ گر چاہیے

رونقیں زندگی کی بہت دیکھ لیں، اب میں آنکھوں کا اپنی کروں گا بھی کیا
اب نہ کچھ دیدنی ہے، نہ کچھ گُفتنی، مجھ کو آقا کی بس اک نظر چاہیے

میں گدائے درِ شاہِ کونین ہوں، شیش محلوں کی مجھ کو تمنّا نہیں
ہو مُیسّر زمیں پر کہ زیرِ زمیں، مجھ کو طیبہ میں اک اپنا گھر چاہیے

ان نئے راستوں کی نئی روشنی، ہم کو راس آئی ہے اور نہ راس آئے گی
ہم کو کھوئی ہوئی روشنی چاہیئے، ہم کو آئینِ خیر البشرؐ چاہیئے

گوشہ گوشہ مدینے کا پُرنور ہے، سارا ماحول جلوؤں سے معمور ہے
شرط یہ ہے کہ ظرفِ نظر چاہیئے، دیکھنے کو کوئی دیدہ ور چاہیئے

مدحتِ شاہِ کون و مکاں کے لئے صرف لفظ و بیاں کا سہارا نہ لو
فنِّ شعری ہے اقبالؔ اپنی جگہ، نعت کہنے کو خونِ جگر چاہیئے

○

کعبہ مِرے دِل میں ہے، مدینہ ہے نظر میں
اب کون سی رونق کی کمی ہے مِرے گھر میں

اس دَر پہ دُعاؤں کی ضرورت نہیں ہوتی
تھوڑا سا سلیقہ ہو اگر دیدۂ تر میں

اب آنکھوں کو میری کوئی بے نور نہ سمجھے
کچھ جلوے سمٹ آئے ہیں دامانِ نظر میں

ہر گام پہ آنکھوں سے ٹپک جاتے ہیں سجدے
کچھ ایسے مقام آتے ہیں طیبہ کے سفر میں

اس شہر سے سورج بھی گزرتا ہے مودّب
کچھ ایسا تقدّس ہے مدینے کی سحر میں

- غزلیات
- قطعات
- متفرّق اشعار

ترتیب

غزلیات

(قافیے اور ردیفیں)

○

اک خطا ہم از رہِ سادہ دلی کرتے رہے
ہر تبسم پر قیاسِ دوستی کرتے رہے

ایسے لوگوں سے بھی ہم مِلتے رہے دل کھول کر
جو وفا کے نام پر سوداگری کرتے رہے

خود اندھیروں میں بسر کرتے رہے ہم زندگی
دوسروں کے گھر میں لیکن روشنی کرتے رہے

سجدہ ریزی پائے ساقی پر کبھی ہم نے نہ کی
اپنے اشکوں سے علاجِ تشنگی کرتے رہے

اپنے ہاتھوں آرزوؤں کا گلا گھونٹا کیے
زندہ رہنے کے لئے ہم خودکشی کرتے رہے

ہر طرف جلتے رہے بُجھتے رہے جھوٹے چراغ
اور ہم سامانِ جشنِ تیرگی کرتے رہے

حالِ دل کہہ دیں کسی سے، بارہا سوچا مگر
اس ارادے کو ہمیشہ ملتوی کرتے رہے

خود کو دیتے بھی رہے ترکِ تعلّق کا فریب
اور درپردہ کسی کو یاد بھی کرتے رہے

اس طرح اقبالؔ گزری ہے ہماری زندگی
زہرِ غم پیتے رہے اور شاعری کرتے رہے

○

کچھ ایسے زخم بھی ہم دل پہ کھائے بیٹھے ہیں
جو چارہ سازوں کی زد سے بچائے بیٹھے ہیں

نہ جانے کون سا آنسو کسی سے کیا کہہ دے
ہم اس خیال سے نظریں جھکائے بیٹھے ہیں

نہ خوفِ بادِ مخالف، نہ انتظارِ سحر
ہم اپنے گھر کے دِیے خود بجھائے بیٹھے ہیں

ہمارا ذوق جدا، وقت کا مزاج جدا
ہم ایک گوشے میں خود کو چھپائے بیٹھے ہیں

ہمارے دل میں ہیں محفوظ چند تاج محل
جنھیں ہم اپنا مقدّر بنائے بیٹھے ہیں

زمانہ دیکھا ہے ہم نے ہماری قدر کرو
ہم اپنی آنکھوں میں دنیا بسائے بیٹھے ہیں

ہم اپنی ذات سے اک عہد ہیں مگر اقبالؔ
ہم اپنے آپ کو قصداً بھلائے بیٹھے ہیں

○

آنکھوں سے نور، دل سے خوشی چھین لی گئی
ہم سے ہماری زندہ دلی، چھین لی گئی

اک روز اتّفاق سے ہم مسکرائے تھے
اُس کی سزا ہیں، ہم سے ہنسی چھین لی گئی

اربابِ کم نظر بھی ہیں، جلووں سے فیض یاب
دیدہ وروں سے، دیدہ وری چھین لی گئی

کتنے چراغ نور سے، محروم ہو گئے
جب سے ہماری خوش نظری چھین لی گئی

شکوہ مرا مزاج، نہ ماتم مری سرشت
ہر چند مجھ سے خندہ لبی چھین لی گئی

صد شکر بالخصوص نوازا گیا مجھے
آنسو عطا ہوئے ہیں، خوشی چھین لی گئی

اقبالؔ، اِس خوشی کا بھروسہ بھی کچھ نہ تھا
اچھا ہوا، یہ دردِ سری چھین لی گئی

○

روشنی مجھ سے گریزاں ہے تو شکوہ بھی نہیں
میرے غم خانے میں کچھ ایسا اندھیرا بھی نہیں

پُرسشِ حال کی فرصت تمھیں ممکن ہے نہ ہو
پُرسشِ حال طبیعت کو گوارا بھی نہیں

یوں سرِ راہ ملاقات ہوئی ہے اکثر
تم نے دیکھا بھی نہیں، ہم نے پکارا بھی نہیں

عرضِ احوال کی عادت بھی نہیں ہے ہم کو
اور حالات کا شاید یہ تقاضا بھی نہیں

بے نیازانہ گزر جائے گزرنے والا
میرے پندار کو اب شوقِ تماشا بھی نہیں

ہاتھ پھیلاؤں میں عیسیٰ نفسوں کے آگے
درد پہلو میں مرے ہے مگر اِتنا بھی نہیں

اک شکن ماتھے پہ دیکھی تھی تمھارے ہم نے
پھر کبھی آنکھ اُٹھا کر تمھیں دیکھا بھی نہیں

آخری بار ہنسی آئی تھی کب ، یاد نہیں
اور پھر آئے ہنسی اِس کی تمنّا بھی نہیں

میرے حالات نہ بدلے تو نہ بدلیں اقبالؔ
مجھ کو حالات پہ کچھ ایسا بھروسہ بھی نہیں

○

شکستِ ظرف کو پندارِ رندانہ نہیں کہتے
جو مانگے سے ملے ہم اُس کو پیمانہ نہیں کہتے

جہاں ساقی کے پائے ناز پر سجدہ ضروری ہو
وہ بُت خانہ ہے، اُس کو رند میخانہ نہیں کہتے

جنوں کی شرطِ اول ضبط ہے اور ضبط مشکل ہے
جو دامن چاک کر لے اُس کو دیوانہ نہیں کہتے

جو ہو جائے کسی کا مستقل، بے شرکتِ غیرے
وہ دل کعبہ ہے، اُس دل کو صنم خانہ نہیں کہتے

نہایت شکریہ اِس پُرسشِ احوال کا لیکن
ہمیں عادت نہیں، ہم اپنا افسانہ نہیں کہتے

جہاں ہر وقت اِک محفل سجی ہو تیری یادوں کی
اُسے عشرت کدہ کہتے ہیں غم خانہ نہیں کہتے

غرض کچھ بھی ہو ہم کو یاد تو رکھتا ہے ہر لحظہ
عدو کو اپنے ہم اقبالؔ! بیگانہ نہیں کہتے

غم تو ہے لیکن، غمِ پیہم نہیں ہے، کم سے کم
آنکھ شاید نم ہو، دامن نم نہیں ہے، کم سے کم

زخمِ دل اپنی جگہ باقی ہے، یہ سچ ہے مگر
زخمِ دل کو حاجتِ مرہم نہیں ہے، کم سے کم

یہ نہیں کہتا کہ میں ہر رنج سے محفوظ ہوں
لیکن اب مافات کا ماتم نہیں ہے، کم سے کم

دل کا عالم آج بھی بے شک بہت مشکوک ہے
جو کبھی پہلے تھا وہ عالم نہیں ہے، کم سے کم

آپ نے کوشش نہ فرمائی سمجھنے کی کبھی
ورنہ میری داستاں مبہم نہیں ہے، کم سے کم

وہ سرِ راہے سہی، رسماً سہی، پرسش تو کی
یہ بھی کیا کم ہے کہ وہ برہم نہیں ہے، کم سے کم

اور کوئی فائدہ محرومیوں کا ہو نہ ہو
اب مجھے احساسِ بیش و کم نہیں ہے، کم سے کم

یوں بظاہر زندگی سے مطمئن کوئی نہیں
آرزو جینے کی پھر بھی کم نہیں ہے، کم سے کم

مختلف ہوتا ہے سب سے کج کلاہوں کا مزاج
زخم خوردہ ہوں، مگر سر خم نہیں ہے، کم سے کم

مثلِ گُل دل خون ہے اقبالؔ لیکن شکر ہے
مثلِ شبنم گریۂ کم کم نہیں ہے، کم سے کم

○

خود فریبی کو ستم ہے آرزو کہتے ہیں لوگ
شوقِ گمراہی کو ذوقِ جستجو کہتے ہیں لوگ

زہر کے ہر گھونٹ کو دیتے ہیں خوش ذوقی کا نام
خونریزی کو لذّتِ جام و سبو کہتے ہیں لوگ

زخمِ دل پر ڈال دیتے ہیں مقدّر کی نقاب
چاکِ پیراہن کو اعجازِ رفو کہتے ہیں لوگ

دیدہ و دانستہ دیتے ہیں نگاہوں کو فریب
پھول کے چاکِ جگر کو رنگ و بُو کہتے ہیں لوگ

ہم کو دل جوئی میں بھی ہے پردہ داری کا خیال
اور دل آزاری کی باتیں رُوبرُو کہتے ہیں لوگ

اس دیارِ غیر میں وہ لُٹ چکی مدّت ہوئی
جس کو خوش فہمی سے اب تک آبرو کہتے ہیں لوگ

اس بیانِ حال سے اقبالؔ اب حاصل بھی کیا
چارہ سازی کے عوض لاتقنطو کہتے ہیں لوگ

○

بالاہتمام ظلم کی تجدید کی گئی
اور ہم کو صبر و ضبط کی تاکید کی گئی

اوّل تو بولنے کی اجازت نہ تھی ہمیں
اور ہم نے کچھ کہا بھی تو تردید کی گئی

انجامِ کار بات شکایات پر رُکی
پُرسش اگرچہ ازرہِ تمہید کی گئی

تجدیدِ التفات کی تجویز رَد ہوئی
ترکِ تعلقات کی تائید کی گئی

اپنی زباں سے میں نے کبھی کچھ نہیں کہا
پھر بھی مرے خلوص پہ تنقید کی گئی

جینے کا کوئی ایک سہارا تو چاہیے
ڈر ڈر کے کی گئی، مگر اُمّید کی گئی

گھر کے چراغ اور بھی بے نُور ہو گئے
اس درجہ خاطرِ مہ و خورشید کی گئی

ہم نے مانا اِس زمانے میں ہنسی بھی جُرم ہے
لیکن اِس ماحول میں افسردگی بھی جُرم ہے

دشمنی تو خیر ہر صورت میں ہوتی ہے گناہ
اِک معین حد سے آگے دوستی بھی جُرم ہے

ہم وفائیں کر کے رکھتے ہیں وفاؤں کی اُمید
دوستی میں اس قدر سوداگری بھی جُرم ہے

اِس سے پہلے زندگی میں اتنی پابندی نہ تھی
اب تو جیسے خود وجودِ زندگی بھی جُرم ہے

آدمی اِس زندگی سے بچ کے جائے بھی کہاں
میکشی بھی جُرم ہے، اور خودکُشی بھی جُرم ہے

سادگی میں جان دے بیٹھے ہزاروں کوہ کن
آدمی سوچے تو، اتنی سادگی بھی جُرم ہے

کتنی دیواریں کھڑی ہیں ہر قدم پر راہ میں
اور ستم یہ ہے کہ شوریدہ سری بھی جُرم ہے

ایک ساغر کے لیے جو بیچ دیں اپنا ضمیر
ایسے رِندوں کے لیے تشنہ لبی بھی جُرم ہے

اپنی بے نوری کا ہم اقبالؔ، ماتم کیوں کریں
آج کے حالات میں دیدہ وری بھی جُرم ہے

○

زہر دے دے نہ کوئی گھول کے پیمانے میں
اب تو جی ڈرتا ہے خود اپنے ہی میخانے میں

سارا ماضی مری آنکھوں میں سمٹ آیا ہے
میں نے کچھ شہر بسا رکھے ہیں ویرانے میں

بے سبب کیسے بدل سکتا ہے رندوں کا مزاج
کچھ غلط لوگ چلے آئے ہیں میخانے میں

جامِ جم سے نگہِ توبہ شکن تک، ساقی
پوری روداد ہے ٹوٹے ہوئے پیمانے میں

پیاس کانٹوں کی بجھاتا ہے لہو سے اپنے
کتنی بالغ نظری ہے ترے دیوانے میں

مجھ پہ تنقید بھی ہوتی ہے تو القاب کے ساتھ
کم سے کم اتنا سلیقہ تو ہے بیگانے میں

اس کو کیا کہتے ہیں اقبالؔ کسی سے پوچھو
دل نہ اب شہر میں لگتا ہے نہ ویرانے میں

درد بڑھ کر خود دوا ہو جائے تو ہم کیا کریں
چارہ گر ہم سے خفا ہو جائے تو ہم کیا کریں

عین ممکن تھا کہ ہم بھی غم سے پا جاتے نجات
دل مگر غم آشنا ہو جائے تو ہم کیا کریں

ہم زباں سے کچھ کہیں تو آپ کا شکوہ بجا
کوئی آنسو لب کشا ہو جائے تو ہم کیا کریں

اپنی جانب سے تو کی ہم نے ہمیشہ احتیاط
پھر بھی بھولے سے خطا ہو جائے تو ہم کیا کریں

ہم سزا کے مستحق ہوتے تو کوئی غم نہ تھا
بے خطا حکمِ سزا ہو جائے تو ہم کیا کریں

ظلم سے ہم ڈر گئے یہ تم سے کس نے کہہ دیا
ظلم قانوناً روا ہو جائے تو ہم کیا کریں

معذرت کرنے کو ہم کر لیں، مگر کس جرم کی
بے سبب کوئی خفا ہو جائے تو ہم کیا کریں

بے وفا کہہ کر تمھیں ہم خود بھی پچھتائے مگر
بے رخی حد سے سوا ہو جائے تو ہم کیا کریں

شکوہ سنجی کی ہمیں اقبالؔ عادت تو نہیں
زندگی صبر آزما ہو جائے تو ہم کیا کریں

○

پرستش اِس کی فطرت ہے، یہ دیوانہ، نہ بدلے گا
چراغوں کے بدل جانے سے پروانہ، نہ بدلے گا

بدلنا ہے تو رندوں سے کہو اپنا چلن بدلیں
فقط ساقی بدل جانے سے میخانہ، نہ بدلے گا

جو ممکن ہو تو سچ مچ کے اُجالے ڈھونڈھ کر لاؤ
چراغِ مضمحل کی ضو سے غم خانہ، نہ بدلے گا

کمی ہے اس میں کرداروں کی، مقصد کی، تاثُر کی
فقط سُرخی بدل جانے سے افسانہ، نہ بدلے گا

سَروں پر تاج رکھ لینے کو سلطانی نہیں کہتے
نہ بدلا ہے یہ اندازِ گدایانہ، نہ بدلے گا

کسی گوشے سے کوئی غزنوی اُٹھے تو ہم جانیں
بتانِ خود تراشیدہ سے بُت خانہ، نہ بدلے گا

دلوں کی تیرگی کا کچھ کرو اے اہلِ کاشانہ
فقط جشنِ چراغاں سے یہ کاشانہ، نہ بدلے گا

○

کچھ ایسے زخم بھی در پردہ ہم نے کھائے ہیں
جو ہم نے اپنے رفیقوں سے بھی چھپائے ہیں

یہ کیا بتائیں کہ ہم کیا گنوا کے آئے ہیں
بس اِک ضمیر بمشکل بچا کے لائے ہیں

یہ کربِ تشنہ لبی اب ہمیں قبول نہیں
کچھ آج سوچ کے ہم، میکدے میں آئے ہیں

کوئی ہواؤں سے کہہ دے اِدھر کا رُخ نہ کریں
چراغ ہم نے سمجھ بُوجھ کر جلائے ہیں

چمن میں اب کے ہوا دیکھیے کدھر کی چلے
خزاں نصیبوں نے پھر آشیاں بنائے ہیں

بدل ہی جاتا ہے غربت میں آدمی کا مزاج
کبھی کبھی ہمیں دشمن بھی یاد آئے ہیں

جہاں بھی ہم نے صدا دی، یہی جواب ملا
یہ کون لوگ ہیں، پوچھو، کہاں سے آئے ہیں

سفر پہ نکلے ہیں ہم پورے اہتمام کے ساتھ
ہم اپنے گھر سے کفن ساتھ لے کے آئے ہیں

اُنھیں پرائے چراغوں سے کیا غرض اقبالؔ
جو اپنے گھر کے دیے خود بجھا کے آئے ہیں

○

ہم بہت دُور نکل آئے ہیں چلتے چلتے
اب ٹھہر جائیں کہیں، شام کے ڈھلتے ڈھلتے

اب غمِ زیست سے گھبرا کے کہاں جائیں گے
عمر گزری ہے اِسی آگ میں جلتے جلتے

رات کے بعد سحر ہو گی مگر کس کے لئے
ہم ہی شاید نہ رہیں رات کے ڈھلتے ڈھلتے

روشنی کم تھی مگر اتنا اندھیرا تو نہ تھا
شمعِ اُمید بھی گُل ہو گئی جلتے جلتے

آپ وعدے سے مُکر جائیں گے رفتہ رفتہ
ذہن سے بات اُتر جاتی ہے ٹلتے ٹلتے

ٹوٹی دیوار کا سایہ بھی بہت ہوتا ہے
پاؤں جل جائیں اگر دھوپ میں چلتے چلتے

دن ابھی باقی ہے اقبالؔ ذرا تیز چلو
کچھ نہ سوجھے گا تمھیں شام کے ڈھلتے ڈھلتے

○

خوشی کا نام نہ لینا، خوشی کا ٹھیک نہیں
سفر میں ساتھ کسی اجنبی کا ٹھیک نہیں

یہ آفتاب کی رونق بھی کتنی دیر کی ہے
قدم بڑھائے چلو، روشنی کا ٹھیک نہیں

سحر نہیں ہے، یہ شاید نظر کا دھوکا ہے
چراغ گُل نہ کرو، تیرگی کا ٹھیک نہیں

نہ جانے کون سی منزل پہ کارواں لُٹ جائے
ذرا سنبھل کے چلو، زندگی کا ٹھیک نہیں

خدا بچائے گلستاں کو باغبانوں سے
یہ گُل فروش ہیں، اِن میں کسی کا ٹھیک نہیں

خود اپنے حال پہ ہنستے ہوں یہ بھی ممکن ہے
جو دل شکستہ ہیں اُن کی ہنسی کا ٹھیک نہیں

مزید عرضِ تمنّا سے فائدہ اقبالؔ؟
جو وعدہ پہلے ہوا تھا اسی کا ٹھیک نہیں

○

بار ہا اُن سے نہ ملنے کی قسم کھاتا ہوں میں
اور پھر یہ بات قصداً بھول بھی جاتا ہوں میں

ڈوبتے دیکھے ہیں اِن آنکھوں سے اِتنے آفتاب
روشنی کے نام سے بھی اب لرز جاتا ہوں میں

اتنی افسردہ دِلی اللہ دشمن کو نہ دے
لوگ ہنستے ہیں تو جی ہی جی میں شرماتا ہوں میں

بے رُخی کو اُن کی سچ مچ بے رُخی سمجھا کیا
آج اپنی اس غلط فہمی پہ پچھتاتا ہوں میں

چاہتا یہ ہوں کہ دنیا مجھ کو تنہا چھوڑ دے
جانے کیوں اب غم گساری سے بھی گھبراتا ہوں میں

○

ہم پیاسوں کے میخانے میں یوں جام چلے ہے
آنکھوں سے چھلک جائے ہے جب شام ڈھلے ہے

کیا پوچھو ہو ہم خانہ خرابوں کی کہانی
مٹّی کا دِیا رُخ پہ ہواؤں کے جلے ہے

تھک جائیں تو سو جائیں کسی پیڑ کے نیچے
ہم خانہ بدوشوں کا یونہی کام چلے ہے

ڈیوڑھی سے تری آج میں کچھ لے کے ٹلوں گا
ٹلتی ہی چلی جائے ہے، جب بات ٹلے ہے

ہم باتیں بھی کر لے ہیں سرِ بزم کسی سے
آنکھوں سے محبت میں بڑا کام چلے ہے

چمکے تو ہے سورج کی طرح حُسن تمھارا
لیکن یہ سمجھ رکھیو کہ سورج بھی ڈھلے ہے

اے سرو سرافراز ذرا دیکھ کے چلیے
اک شہرِ خموشاں ترے قدموں کے تلے ہے

دیوانے کے ہاتھوں میں یہ مٹّی ہے کہاں کی
چومے ہے کبھی اور کبھی آنکھوں سے ملے ہے

جو جاوے ہے کوچے میں ترے، آوے ہے گھائل
تلوار کھنچے ہے نہ کوئی تیر چلے ہے

دیوانے کی یہ بات، بڑی بات ہے پیارے
سب پوچھیں ہیں لیکن وہ ترا نام نہ لے ہے

ماحول کا شکوہ کبھی اقبالؔ نہ کیجو
وہ پھول بھی مہکے ہے جو کانٹوں میں پلے ہے

○

اِس بھری محفل میں اپنا مدعا کیسے کہیں
اِتنی نازک بات اُن سے برملا کیسے کہیں

ان کی بیگانہ روی کا رنج ہے ہم کو مگر
ان کو خود اپنی زباں سے بے وفا کیسے کہیں

وہ خفا ہیں ہم سے شاید بر بنائے احتیاط
اُن کی مجبوری کو بے سمجھے جفا کیسے کہیں

اہلِ محفل لے اُڑیں گے اِس ذرا سی بات کو
اُن کے اندازِ حیا پر مرحبا کیسے کہیں

خود ہماری ذات سے کیا فیض پہنچا ہے اُنھیں
دوستوں کی بے رُخی کو ناروا کیسے کہیں

جس قدر وہ باخبر ہے ہم سے، کوئی بھی نہیں
اپنے دشمن کو بھلا ناآشنا کیسے کہیں

اُن کو جب خود ہی نہ ہو اقبالؔ اپنوں کا خیال
بے حیا بن کر کہو ہم مدعا کیسے کہیں

بظاہر بے رُخی ہے اور کرم پوشیدہ پوشیدہ
تخاطب اب بھی ہوتا ہے مگر دزدیدہ دزدیدہ

وہ کیا آئے مری خلوت میں میخانہ چلا آیا
نظر خوابیدہ خوابیدہ قدم لغزیدہ لغزیدہ

شکستِ حُسن کے منظر بھی اِن آنکھوں نے دیکھے ہیں
رُخِ افسردہ افسردہ، لبِ لرزیدہ لرزیدہ

کوئی یوں سُن رہا تھا رات مجھ سے میرا افسانہ
کبھی شرمندہ شرمندہ، کبھی نم دیدہ نم دیدہ

تعلق اُن سے باقی ہے فقط صاحب سلامت تک
ملاقاتیں بھی ہوتی ہیں مگر سنجیدہ سنجیدہ

کسی کے ہاتھ نے مجھ کو سہارا دے دیا ورنہ
کہاں میں اور کہاں یہ راستے پیچیدہ پیچیدہ

وہی اقبالؔ، جس کو ناز تھا کل خوش مزاجی پر
نظر آتا ہے محفل میں بھی کچھ رنجیدہ رنجیدہ

○

سفر میں عمر کٹی اور دھوپ میں بھی چلے
مگر نہ پیر ہمارے تھکے نہ پاؤں جلے

قدم اُٹھے ہیں تو منزل بھی مل ہی جائے گی
سفر طویل و مسلسل سہی، چلے تو چلے

تم اپنی بزم کی رونق کا اہتمام کرو
ہمارے گھر کے چراغوں کا کیا جلے نہ جلے

جو زر خرید محبت بھی خوش نصیبی ہے
تو خوش نصیبوں سے ہم جیسے بدنصیب بھلے

تمھارے بعد چراغوں کا کام ہی کیا تھا
نہ تم ہی لوٹ کے آئے نہ پھر چراغ جلے

کسی کا بوجھ کوئی اور کیا اُٹھائے گا
سِسک رہا ہے زمانہ خود اپنے بوجھ تلے

نہ جانے کون سی منزل پہ کارواں لوٹا
کوئی نہیں جو مرے ساتھ دو قدم بھی چلے

پرانی باتوں کا کیا ذکر اِس زمانے میں
اندھیرا اب نہیں ہوتا کہیں چراغ تلے

کسی کی یاد نے دامن بڑھا دیا اقبالؔ
چھلک گئیں مری آنکھیں کبھی جو شام ڈھلے

اے اہلِ وفا دادِ جفا کیوں نہیں دیتے
سوئے ہوئے زخموں کو جگا کیوں نہیں دیتے

اس جشنِ چراغاں سے تو بہتر تھے اندھیرے
اِن جھوٹے چراغوں کو بجھا کیوں نہیں دیتے

جس میں نہ کوئی رنگ نہ آہنگ نہ خوشبو
تم ایسے گلستاں کو جلا کیوں نہیں دیتے

دیوار کا یہ عذر سُنا جائے گا کب تک
دیوار اگر ہے تو گرا کیوں نہیں دیتے

چہروں پہ جو ڈالے ہوئے بیٹھے ہیں نقابیں
اُن لوگوں کو محفل سے اُٹھا کیوں نہیں دیتے

توبہ کا یہی وقت ہے کیا سوچ رہے ہو
سجدے میں جبینوں کو جھکا کیوں نہیں دیتے

یہ جھوٹے خدا مل کے ڈبو دیں گے سفینہ
تم ہادیِ برحق کو صدا کیوں نہیں دیتے

○

اُن کو مری وفاؤں کا اقرار بھی نہیں
اور پوچھیے تو جُرأتِ انکار بھی نہیں

میرے خلوص پر جو بھروسہ نہ ہو تمھیں
مجھ کو تعلّقات پہ اصرار بھی نہیں

ہیں میرے غمگسار اگر مجھ سے بدگماں
میں غمگساریوں کا طلب گار بھی نہیں

گُل کر دیے چراغ کسی نے تو کیا ہوا
اب روشنی سے ہم کو سروکار بھی نہیں

کام اُن سے آپڑا ہے مقدر کی بات ہے
ہم جن سے گفتگو کے روادار بھی نہیں

اُن راستوں سے ہو کے گزر آئی زندگی
جن راستوں میں سایۂ دیوار بھی نہیں

ماضی بہت عزیز ہے اقبالؔ کو، مگر
وہ عہدِ رفتگاں کا عزادار بھی نہیں

○

شورِ منزل طلبی اپنی جگہ باقی ہے
شوقِ گمراہ روی اپنی جگہ باقی ہے

یہ نہیں ہے کہ میں محرومِ کرم ہوں، لیکن
شدّتِ تشنہ لبی اپنی جگہ باقی ہے

اور ہر چیز بدل ڈالی وطن والوں نے
بس غریب الوطنی اپنی جگہ باقی ہے

کوئی دامن ہے سلامت نہ گریباں محفوظ
دعوئے بخیہ گری اپنی جگہ باقی ہے

اور خدشہ کوئی رستے میں کہیں ہو کہ نہ ہو
خدشۂ راہ بری اپنی جگہ باقی ہے

میں تو سمجھا تھا کہ لے ڈوبیں گے حالات مجھے
شکر ہے زندہ دلی اپنی جگہ باقی ہے

تم نہ دیکھو یہ الگ بات ہے ورنہ اقبالؔ
شہر کی جلوہ گری اپنی جگہ باقی ہے

خوشی سے چوٹ کھا لیتے ہیں، نَم دیدہ نہیں ہوتے
جو اہلِ دل ہیں آسانی سے رنجیدہ نہیں ہوتے

زمانہ ہم پہ ہنستا ہے، مگر ہم کچھ نہیں کہتے
ہنسی کی بات میں ہم لوگ سنجیدہ نہیں ہوتے

کنارے بھی مُمد ہوتے ہیں تشکیلِ تلاطم میں
وہ خوابیدہ نظر آتے ہیں، خوابیدہ نہیں ہوتے

بڑے اسرار پوشیدہ ہیں اس تنہا پسندی میں
یہ مت سمجھو کہ دیوانے، جہاں دیدہ نہیں ہوتے

چمن کی سیر ہم کرتے ہیں لیکن خوش نگاہی سے
فقط محظوظ ہو لیتے ہیں، گرویدہ نہیں ہوتے

تصوّر خود بنا لیتا ہے آوازوں سے تصویریں
مری محفل میں نادیدہ بھی نادیدہ نہیں ہوتے

تعجّب کیا اگر اقبالؔ دنیا مجھ سے ناخوش ہے
بہت سے لوگ دنیا میں پسندیدہ نہیں ہوتے

۲۳۰

مانا کہ زندگی سے ہمیں کچھ مِلا بھی ہے
اِس زندگی کو ہم نے بہت کچھ دیا بھی ہے

محسوس ہو رہا ہے کہ تنہا نہیں ہوں میں
شاید کہیں قریب کوئی دوسرا بھی ہے

قاتل نے کس صفائی سے دھوئی ہے آستیں
اُس کو خبر نہیں کہ لہو بولتا بھی ہے

غرقاب کر دیا تھا ہمیں ناخدا نے آج
وہ تو کہو کہ ایک ہمارا خدا بھی ہے

ساقی خفا ہے مجھ سے یہ معلوم ہے مجھے
لیکن وہ میرے ظرف کو پہچانتا بھی ہے

اے قافلے کے لوگو ذرا جاگتے رہو
سُنتے ہیں قافلے میں کوئی رہنما بھی ہے

ہم پھر بھی اپنے چہرے نہ دیکھیں تو کیا علاج
آنکھیں بھی ہیں، چراغ بھی ہے، آئینہ بھی ہے

ہو تو رہی ہے کوششِ آرائشِ چمن
لیکن چمن غریب میں اب کچھ رہا بھی ہے

یہ حُسنِ اتّفاق ہے یا حُسنِ اہتمام
ہے جس جگہ فُرات وہیں کربلا بھی ہے

اقبالؔ شُکر بھیجو کہ تم دیدہ ور نہیں
دیدہ وروں کو آج کوئی پوچھتا بھی ہے

○

زہر کے گھونٹ بھی ہنس ہنس کے پیے جاتے ہیں
ہم بہر حال سلیقے سے جیے جاتے ہیں

ایک دن ہم بھی بہت یاد کیے جائیں گے
چند افسانے زمانے کو دیے جاتے ہیں

ہم کو دنیا سے محبت بھی بہت ہے لیکن
لاکھ الزام بھی دنیا کو دیے جاتے ہیں

بزمِ اغیار سہی، از رہِ تنقید سہی
شکر ہے ہم بھی کہیں یاد کیے جاتے ہیں

ہم کیے جاتے ہیں تقلیدِ روایاتِ جنوں
اور خود چاکِ گریباں بھی سیے جاتے ہیں

غم نے بخشی ہے یہ محتاط مزاجی ہم کو
زخم بھی کھاتے ہیں آنسو بھی پیے جاتے ہیں

حال کا ٹھیک ہے اقبالؔ نہ فردا کا یقیں
جانے کیا بات ہے ہم پھر بھی جیے جاتے ہیں

کیسی آہیں، کیسے آنسو، کیسا غم
ہم کو دیکھو، کس طرح زندہ ہیں ہم

کوئی کس دل سے کہے رُوداد غم
آپ بھی ہیں آبدیدہ، ہم تو ہم

رہبر و رہزن کا رستہ ایک ہے
کیا خبر، کس کے ہیں یہ نقشِ قدم

مجھ کو عرضِ حال کی عادت نہیں
منتظر ہے آج تک چشمِ کرم

جو ہوا، تقدیر کے ہاتھوں ہوا
کوئی بھی مجرم نہیں ہے، تم نہ ہم

اُن کے ذوقِ جستجو کو کیا کہیں
جو ہیں پابندِ نشاناتِ قدم

اس کو کیا کہتے ہیں خود ہی سوچیے
آستیں نم، آنکھ نم، دامن بھی نم

دوستی کے کچھ تقاضے بھی تو ہیں
پُرسشِ احوال تو ہو کم سے کم

لطف تو اقبالؔ اُن راہوں میں ہے
ہر قدم پر جن میں ہوں کچھ پیچ و خم

ایک سجدہ سر فروشانہ بصد عجز و نیاز
یوں ادا ہوتی ہے اربابِ محبت کی نماز

آرزو الزام، شکوہ جُرم، مایوسی گناہ
ہو سزا مقصود تو ستّر بہانے سو جواز

باوجودِ ضبطِ غم، باوصفِ ترکِ گفتگو
کُھل ہی جاتے ہیں نگاہوں سے دلوں کے چند راز

کون سُنتا ہے کسی کی اس خراب آباد میں
مختصر لمحاتِ فرصت اور افسانے دراز

اہلِ محفل یہ بُھلا دیتے ہیں فرطِ شوق میں
گُل بھی ہو سکتی ہیں شمعیں، ٹوٹ بھی سکتے ہیں ساز

عشق میں پندارِ سلطانی بھی کھا جاتا ہے مات
ایک مردِ بُت شکن اور بندۂ زلفِ ایاز

مِل گئے آنکھوں ہی آنکھوں میں سوالوں کے جواب
یوں بھری محفل میں بھی جاری رہے راز و نیاز

○

بس ہو چکا حضور یہ پردے ہٹائیے
سب منتظر ہیں، سامنے تشریف لائیے

آواز میں تو آپ کی بے شک خلوص ہے
لیکن ذرا نقاب تو رُخ سے اُٹھائیے

ہم مانتے ہیں آپ بڑے غم گُسار ہیں
لیکن یہ آستین میں کیا ہے دکھائیے

اب قافلے کے لوگ بھی منزل شناس ہیں
آخر کہاں کا قصد ہے، کُھل کر بتائیے

صحنِ چمن میں آگ لگی، روشنی ہوئی
اِس روشنی سے اپنا شبستاں سجائیے

لُٹ تو چکی بہار، اُجڑ تو چُکا چمن
اب کیا ہے، خوب جشنِ بہاراں منائیے

بادہ کشوں کی اصل جگہ میکدے میں ہے
کس نے کہا کہ آپ بھی منبر پہ آئیے

گھر پھونک کر جناب مگر مطمئن نہ ہوں
شعلے قریب آگئے دامن بچائیے

روئے سخن ہے کس کی طرف یہ نہ پوچھیے
"پہچان پر ہے ناز تو پہچان جائیے"

نقاب پوشوں کو للّٰہ رہنما نہ کرو
خطا کرو بھی تو اتنی بڑی خطا نہ کرو

تمھارا نام ہے منسوب کج کلاہوں سے
گداگروں کی طرح عرضِ مدعا نہ کرو

قصور کس کا ہے اپنے ضمیر سے پوچھو
خدا کے واسطے تقدیر کا گلہ نہ کرو

دعا بھی صرف عزائم کا ساتھ دیتی ہے
دوائے درد بھی ڈھونڈھو فقط دعا نہ کرو

صفیں درست کرو اور قدم ملا کے بڑھو
یہ وقت اور ہے اب صرف التجا نہ کرو

جو ہو سکے تو تقاضائے وقت پہچانو
گھروں میں بیٹھ کے اوروں پہ تبصرہ نہ کرو

ہر ایک بات کا اک وقت ہے سخن سازو
مجادلے کی گھڑی میں مشاعرہ نہ کرو

غزل کے ساز پر نغمہ سُنا کر کیا کریں گے
ہم اپنے ساتھ اوروں کو رُلا کر کیا کریں گے

ہمارا غم، ہمارا ایک ذاتی مسئلہ ہے
زمانے بھر کو افسانہ سُنا کر کیا کریں گے

مسیحا اپنے ہی زخموں کا ماتم کر رہے ہیں
ہم اپنا زخمِ دل، اُن کو دکھا کر کیا کریں گے

ابھی باقی ہے تھوڑا سا لہو قلبِ حزیں میں
ابھی سے اہلِ دل، آنسو بہا کر کیا کریں گے

چمن کے لوگ جب خود ہیں شریکِ گُل فروشی
تو ہم اپنا نشیمن ہی بچا کر کیا کریں گے

تعلّق اب بھی باقی ہے پُرانے دوستوں سے
نئے لوگوں کو ہم دشمن بنا کر کیا کریں گے

جسے دیکھو وہی اقبالؔ مصروفِ بُکا ہے
ہمیں بے وجہ جبراً مُسکرا کر کیا کریں گے

صرف ترتیبِ چمن کام تھا فرزانوں کا
حفظِ ناموسِ چمن فرض ہے دیوانوں کا

صرف تنقید سے ممکن نہیں تجدیدِ بہار
اور بھی کچھ ہے تقاضا ترے ویرانوں کا

صرف رہبر ہی کو الزام پہ الزام نہ دو
راہ دشوار ہے اور ساتھ ہے نادانوں کا

حقِّ تنقید تمھیں ہے مگر اس شرط کے ساتھ
جائزہ لیتے رہو اپنے گریبانوں کا

تشنہ کاموں پہ بھی پڑنے لگی ساقی کی نظر
ہم نے دستور بدل ڈالا ہے میخانوں کا

اک قدم اور بہ پندارِ یقینِ محکم
رُخ بدل سکتا ہے بڑھتے ہوئے طوفانوں کا

اب کے لگ جائے تو لگ جائے کنارے کشتی
ورنہ معلوم ہے انجام مسلمانوں کا

○

بستیاں خاموش ہیں خلقِ خدا خاموش ہے
راستے ویران ہیں ساری فضا خاموش ہے

ایک ایسا سانحہ پیش آگیا ہے راہ میں
کارواں تو کارواں خود رہنما خاموش ہے

پا شکستہ ہو کے یوں بیٹھا ہے سارا قافلہ
دم بخود ہیں منزلیں بانگِ درا خاموش ہے

اس صفِ ماتم میں سب اپنے پرائے ہیں شریک
آشنا خاموش ہے، ناآشنا خاموش ہے

میکدوں میں رند افسردہ ہیں پیمانے اُداس
خانقاہوں میں غرورِ اتقا خاموش ہے

ہم نے ناموسِ براہیمؑ کو رُسوا کر دیا
اس خطا پر وسعتِ ارض و سما خاموش ہے

عظمتِ اسلاف کے ماتھے پہ بل ہیں سیکڑوں
اس ہزیمت پر وقارِ کربلا خاموش ہے

ہم نے حقِ مغفرت کو اپنا ورثہ جان کر
یہ تصوّر کرلیا قہرِ خدا خاموش ہے

اب خطا کاروں میں توبہ کی جسارت بھی نہیں
وہ ندامت ہے کہ خود دستِ دعا خاموش ہے

اب ہوا ہے ہم کو احساسِ خطا بعد از خطا
آنکھ پُر نم ہے زبانِ التجا خاموش ہے

اب بھی ممکن ہے مگر سارے گناہوں کا علاج
یہ نہ سمجھو چشمۂ عفوِ خطا خاموش ہے

دل سے کی جائیں تو ہوتی ہیں دعائیں مستجاب
یہ غلط ہے مالکِ ہر دوسرا خاموش ہے

کیا عجب یہ آزمائش ہو ہمارے ظرف کی
بر بنائے مصلحت شاید خدا خاموش ہے

○

چمن کی خاک تجدیدِ بہاراں چاہتی ہے
نئے ہاتھوں سے تہذیبِ گلستاں چاہتی ہے

بہاراں سازو سامانِ بہاراں چاہتی ہے
نئے دامن، نئے چاکِ گریباں چاہتی ہے

فقط ذکرِ سحر سے تابہ کے، تسکینِ خاطر
سحر، سچ مچ سحر، شامِ غریباں چاہتی ہے

چراغوں کے عوض دوزخ کے شعلے بھی گوارا
کہ اب ظلمت بہرِ قیمت چراغاں چاہتی ہے

عزائم سے تبسّم مانگتی ہے چشمِ گریاں
تبسّم اور تبسّم برق ساماں چاہتی ہے

○

راتوں کو کچھ چراغوں سے چمکا دیا گیا
ہم کو سحر کے نام پہ دھوکا دیا گیا

زنداں بھی تاکہ ہم کو گلستاں دکھائی دے
کُنجِ قفس کو پھولوں سے مہکا دیا گیا

جھوٹے چراغ بزم میں روشن کیے گئے
جلووں کا زہر آنکھوں میں ٹپکا دیا گیا

زخموں پہ تاکہ اوروں کی نظریں نہ پڑ سکیں
زخمی بدن سلیقے سے کفنا دیا گیا

مقتل کو نامِ گنجِ شہیداں عطا ہوا
نغموں سے سوگواروں کو بہلا دیا گیا

جشنِ شکست ہم نے منایا بالاہتمام
غیرت کو دھوم دھام سے دفنا دیا گیا

ہم نے وفا کے نام پہ کیا کچھ نہیں دیا
لیکن یہ سوچیے کہ ہمیں کیا دیا گیا؟

○

رُخ لاکھ منزلوں کے بدلتے چلے گئے
ہم اضطرابِ شوق میں چلتے چلے گئے

دیوانے جب اُٹھے تو فضائیں بدل گئیں
صدہا چراغ راہ میں جلتے چلے گئے

طوفان آئے، حشر اُٹھے، آندھیاں چلیں
لیکن قدم کچھ اور سنبھلتے چلے گئے

یوں بھی ہوا ہے عزمِ غلط میں کبھی کبھی
ہم اپنی حد سے آگے نکلتے چلے گئے

عزمِ سفر گروہوں میں تقسیم ہو گیا
سب اپنی اپنی راہ بدلتے چلے گئے

اپنا ضمیر بیچ کے نیند آ گئی ہمیں
سارے اصول خوابوں میں ڈھلتے چلے گئے

ہم اپنی منزلوں کا تعیّن کیے بغیر
کیا جانے کس خیال میں چلتے چلے گئے

ظلمت کو ہم نے اپنا مُقدّر بنا لیا
لمحے طلوعِ صبح کے ٹلتے چلے گئے

نظریں بدل گئی تھیں تو کچھ ایسا غم نہ تھا
ذہنوں کے زاویے بھی بدلتے چلے گئے

اقبالؔ ہم سے کوئی مخاطب نہیں ہوا
یہ کون لوگ تھے، جو نکلتے چلے گئے

○

حادثاتِ سحر و شام کو الزام نہ دو
حسبِ عادت غمِ ایّام کو الزام نہ دو

تم نے خود نُور کا ظلمت سے کیا ہے سودا
کر کے توہینِ سحر، شام کو الزام نہ دو

تم نے خود اپنے پَر و بال کی تعظیم نہ کی
اب فریبِ قفس و دام کو الزام نہ دو

تم نے پیغام کا مفہوم غلط سمجھا تھا
مقصدِ صاحبِ پیغام کو الزام نہ دو

عینِ مقصود سمجھ بیٹھے تھے آغاز کو تم
اب اُس آغاز کے انجام کو الزام نہ دو

اپنے مشکوک عزائم کو عزائم کہہ کر
پَے بہ پَے کوششِ ناکام کو الزام نہ دو

تم نے خود آگ لگائی ہے چمن میں اپنے
بے سبب گردشِ ایّام کو الزام نہ دو

اُن کو یہ اصرار ہے اُن سے خطا ممکن نہیں
ایسی صورت میں تو کوئی فیصلہ ممکن نہیں

اپنی اُفتادِ طبیعت کو میں آخر کیا کروں
اور سب ممکن ہے، عرضِ مدعا ممکن نہیں

صرف اُن کے مشورے پر منحصر ہے زندگی
اور ستم یہ ہے کہ اُن سے مشورہ ممکن نہیں

دوستی کے بعض پہلو چاہتے ہیں تبصرہ
اور دل آزاری کے ڈر سے تبصرہ ممکن نہیں

زندہ رہنے کے لیے ہم زہر بھی پیتے رہے
زندگی دشوار ہو سکتی ہے، ناممکن نہیں

کوہ کن کے نام سے زندہ ہے پندارِ جنوں
آدمی چاہے تو اِس دنیا میں کیا ممکن نہیں

اُن کو خود آجائے تو اقبالؔ آجائے خیال
کم سے کم میری زباں سے التجا ممکن نہیں

ہم سفر ہیں ہیں فقط پُر پیچ راہوں کے لئے
حادثے معمول ہیں ہم کج کلاہوں کے لئے

سرزنش، تنقید، نفرت، تلخیاں، رسوائیاں
نصب ہیں کتنی صلیبیں بے گناہوں کے لئے

اُن سے کوئی کیا کہے، بے خواب غم خانوں کا حال
ساری نیندیں وقف ہیں جن خواب گاہوں کے لئے

اُن سے بہتر شہر کی بے نور گلیوں کا سکوت
قافلے بیتاب ہیں جن شاہراہوں کے لئے

اُن کو کیا معلوم بے رونق خرابوں کا مقام
وقف ہیں جن کی جبینیں بارگاہوں کے لئے

تیرگی تو پیش خیمہ ہے طلوعِ صبح کا
تیرگی اک عذر ہے گم کردہ راہوں کے لئے

خوش نگاہی شرط ہے اقبالؔ! راہِ شوق میں
روشنی بھی تیرگی ہے کم نگاہوں کے لئے

○

قدم قدم پہ فریبِ نظر، چمن کا چمن
نظر غریب بچائے کہاں کہاں دامن

بہار ہو کہ خزاں دونوں ترجمانِ چمن
مزاج ایک ہے بدلے ہوئے ہیں پیراہن

نہ باغباں، نہ بہاراں، نہ غنچہ و شبنم
چمن، چمن کو بناتے ہیں کچھ تہی دامن

تمھارے دعوئے ساقی گری کا کیا کہنا
تمھارے پاس ہی بیٹھے ہیں چند تشنہ دہن

یہ اور بات ہے اہلِ چمن کو یاد نہیں
کبھی بہارِ چمن تھے یہ چاک پیراہن

یہ چاند تارے بجھا دے کوئی تو اچھا ہو
کہ اِن سے ہوتی ہے کچھ اور تیرگی روشن

زمانہ سازی کا فن ہم نے کیوں نہیں سیکھا
ہم اہلِ ظرف ہیں خود اپنی جان کے دشمن

○

کچھ ایسی شمعیں جلائی گئی ہیں محفل میں
کہ روشنی بھی نگاہوں کو روشنی نہ لگے

اک ایسے شخص سے بھی راہ و رسم ہے اپنی
جو بے رُخی سے ملے اور اجنبی نہ لگے

عجیب حال ہے کچھ اِن دنوں طبیعت کا
کہ غم بُرا نہ لگے اور خوشی، خوشی نہ لگے

کہاں سے سیکھی ہے ظالم نے یہ سبک دستی
کہ دل کا خون بھی ہو جائے چوٹ بھی نہ لگے

کچھ اپنا حال بھی ہم آپ کو سنا دیتے
ہماری بات اگر آپ کو بُری نہ لگے

کوئی بتاؤ کہ وہ جائے تو کہاں جائے
خود اپنے گھر میں بھی جس آدمی کا جی نہ لگے

کچھ ایسے دوست بھی اکثر ہمیں ملے اقبالؔ
کہ جن کی تلخ نوائی بھی دشمنی نہ لگے

○

جو بے وفا نظر آتا ہے باوفا ہی نہ ہو
یہ بے رخی بھی محبت کی اک ادا ہی نہ ہو

ہم آدمی سے فرشتے تو بن نہیں سکتے
وہ چاہتے ہیں کہ ہم سے کبھی خطا ہی نہ ہو

اب اتنی سادہ دلی بھی خدا کسی کو نہ دے
کہ وہ کسی سے کسی بات پر خفا ہی نہ ہو

بس ایک شکل ہے چارہ گروں سے بچنے کی
وہ زخم کھاؤ کہ جس کی کوئی دوا ہی نہ ہو

یہ کس کی لاش نظر آ رہی ہے ساحل پر
چلو قریب سے دیکھیں وہ ناخدا ہی نہ ہو

شیوخِ شہر کو تم دیکھ کر پلٹ آئے
کسی سے پوچھ تو لیتے وہ میکدہ ہی نہ ہو

میں اپنی بے نگہی پر یہ سوچ کر چپ ہوں
یہ جرمِ دیدہ وری کی کہیں سزا ہی نہ ہو

ہیں مری روداد سے مغموم لوگ
کچھ غلط سمجھے مرا مفہوم لوگ

گھر سے چل کر ہم کہاں تک آ گئے
اجنبی ماحول ، نا معلوم لوگ

اک ذرا آہستہ اے آتش نوا
ہیں اسی محفل میں کچھ مغموم لوگ

لُٹ گئے کل ہم بھرے بازار میں
مل گئے رستے میں کچھ معصوم لوگ

جانے اہلِ ظلم بستے ہیں کہاں
ہم کو ملتے ہیں فقط مظلوم لوگ

تجربوں نے بارہا تنبیہ کی
پھر بھی دھوکا کھا گئے معصوم لوگ

دے گئے اقبالؔ ہم کو زندگی
زندۂ جاوید کچھ مرحوم لوگ

○

وقت بھی توبہ شکن، ماحول بھی توبہ شکن
ایسے عالم میں کسے آواز دیں تشنہ دہن

ایسی صورت میں بیانِ حالِ دل کا کیا سوال
تم مزاجاً کم سخن، اور ہم اصولاً کم سخن

شانِ محجوبی اِدھر، پندارِ محبوبی اُدھر
میرے ماتھے پر پسینہ، اُن کے ماتھے پر شکن

کتنی بامقصد ہے اُن کی ہر نگاہِ بے نیاز
دل شکن، پیماں شکن، توبہ شکن، ایماں شکن

اُن کی محفل میں ہمارا تذکرہ ہے اِن دنوں
اللہ اللہ ہم بھی ہیں اقبالؔ، موضوعِ سخن

○

غم تو یوں اور بھی تھے آپ کے غم سے پہلے
دل کا یہ حال نہ تھا حُسنِ کرم سے پہلے

ہم پہ الزام ہے، افسردہ مزاجی کا، مگر
اتنی رونق بھی نہ تھی بزم میں ہم سے پہلے

آپ کے لطف و عطا نے ہمیں گستاخ کیا
ہم تو واقف بھی نہ تھے چشمِ کرم سے پہلے

ہم تو پیاسے ہی چلے آتے ہیں میخانے سے
کچھ ثقہ لوگ پہنچ جاتے ہیں ہم سے پہلے

لوگ غیروں کو بھی آنکھوں پہ بٹھا لیتے تھے
وہ بھی اک دور تھا، اِس دورِ ستم سے پہلے

آپ کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھے جاتے
یہ سزا آپ نہ دیں شکوۂ غم سے پہلے

بات کا پاس، محبت کا بھرم ہے اقبالؔ
یہ بُھلا دیتے ہیں ہم قول و قسم سے پہلے

تم غیروں سے ہنس ہنس کے ملاقات کرو ہو
اور ہم سے وہی زہر بھری بات کرو ہو

بچ بچ کے گزر جاؤ ہو تم پاس سے میرے
تم تو بخدا غیروں کو بھی مات کرو ہو

نشتر سا اُتر جاوے ہے سینے میں ہمارے
جب ماتھے پہ بَل ڈال کے تم بات کرو ہو

تقوے بھی بہک جاویں ہیں محفل میں تمھاری
تم اپنی اِن آنکھوں سے کرامات کرو ہو

پھولوں کی مہک آوے ہے سانسوں میں تمھاری
موتی سے بکھر جاویں ہیں جب بات کرو ہو

ہم غیروں کے آگے تمھیں کیا حال بتا دیں
پاس آ کے سُنو دور سے کیا بات کرو ہو

کیا کہہ کے پُکاریں گے تمھیں لوگ یہ سوچو
اقبالؔ پہ تم ظلم تو دن رات کرو ہو

○

یہ ادائے خود فریبی تو مزاج ہے ہمارا
نہ قریب تھا کنارا، نہ قریب ہے کنارا

نہ خطا ہے دوستوں کی نہ قصور ہے تمھارا
مجھے راہِ دوستی میں مری سادگی نے مارا

غمِ زندگی بھی میں نے بخوشی کیا گوارا
نہ کسی سے التجا کی نہ کبھی تمھیں پکارا

جو سفینہ ڈوبتا ہے تو بلا سے ڈوب جائے
مرے ناخدا سے کہہ دو مجھے بخش دے خدا را

مجھے تم نے یاد رکھا یہ کرم بھی کم نہیں ہے
سرِ راہ مجھ کو پوچھا یہ خلوص ہے تمھارا

نہ کبھی زباں کھلی ہے نہ کبھی زباں کھلے گی
جو شکست ہے مقدر تو شکست بھی گوارا

کبھی ہم بھی چاہتے تھے کہ ملیں کہیں سہارے
مگر اب یہ ڈر رہے ہیں کوئی دے نہ دے سہارا

○

اُٹھے تو صبحِ درخشاں، جھکے تو ظلمتِ شام
تری نگاہ پہ قائم ہے زندگی کا نظام

یہ خم بہ خم ترے گیسو یہ کافرانہ خرام
زفرق تا بقدم شعرِ حافظ و خیّام

تری جبیں پہ طلوعِ سحر کی پہلی کرن
ترے لبوں پہ بہاروں کا اوّلیں پیغام

نظر جھکی تو ہوا بند بابِ مے خانہ
نظر اُٹھی تو ہوئے چُور چُور شیشہ و جام

بغیر لفظ و بیاں گفتگو سرِ محفل
نفس نفس ہیں فسانے نظر نظر میں پیام

قدم بڑھیں تو بدل جائے وقت کی رفتار
قدم رُکیں تو ٹھہر جائے گردشِ ایّام

نہ جانے کون سی منزل ہے یہ محبت کی
نہ پُرسشیں، نہ تخاطب، نہ گفتگو نہ سلام

○

غلط معنی دیئے جاتے ہیں زیرِ لب تبسّم کو
سمجھ پائے نہ اب تک لوگ۔ اِس خاموش قلزم کو

بڑا دھوکا دیا ہم کو ہماری خوش خیالی نے
نہ جانے کیا سمجھ بیٹھے نگاہوں کے تصادم کو

محبت میں خطائیں ایک جانب سے نہیں ہوتیں
نہ تم الزام دو ہم کو نہ ہم الزام دیں تم کو

کچھ آنسو پھوٹ نکلے خود بخود کل رات آنکھوں سے
جہاں تک ہو سکا روکے رہے ہم اس تلاطم کو

زباں خاموش، ماتھے پر شکن، آنکھوں میں افسانے
کوئی سمجھائے کیا کہتے ہیں اس طرزِ تکلّم کو

تمھیں ناراض ہونے کا سلیقہ بھی نہیں آتا
شکن ماتھے پہ ڈالو، اور روکو اس تبسّم کو

زمانہ ہو گیا اقبالؔ! ہم اک ساتھ رہتے ہیں
تعجب ہے سمجھ پائے نہ تم ہم کو، نہ ہم تم کو

○

آپ چاہے بھول جائیں قصّۂ عہدِ شباب
آپ کو اب تک دعا دیتے ہیں کچھ خانہ خراب

اس طرح ترتیب پاتی ہے محبت کی کتاب
چند ناگفتہ فسانے، چند بے تعبیر خواب

اک نگاہِ پُر تکلّف، سَو خطابوں کا خطاب
ایک زیرِ لب تبسّم، سَو جوابوں کا جواب

میری جانب اُٹھ رہی ہے پھر نگاہِ احتساب
مجھ سے مانگا جا رہا ہے دل کے زخموں کا حساب

کش مکش میں مُبتلا ہے آج ذوقِ انتخاب
چشمِ ساقی رُوبرو، پیشِ نظر جامِ شراب

کس نے اپنے روئے روشن سے اُلٹ دی ہے نقاب
ہر طرف بکھرے پڑے ہیں جیسے صدہا آفتاب

اب وہاں اقبالؔ جیسے لوگ ہوں کیا باریاب
اُن کی محفل میں کئی حضرات ہیں گردوں جناب

ہر چند گام گام حوادث سفر میں ہیں
وہ خوش نصیب ہیں جو تری رہ گزر میں ہیں

تاکیدِ ضبط، عہدِ وفا، اذنِ بندگی
کتنے پیام، اِک نگہِ مختصر میں ہیں

ماضی شریکِ حال ہے کوشش کے باوجود
دُھندلے سے کچھ نقوش ابھی تک نظر میں ہیں

لِلّٰہ اس خلوص سے پُرسش نہ کیجیے
طوفان کب سے بند مری چشمِ تر میں ہیں

منزل تو خوش نصیبوں میں تقسیم ہو چکی
کچھ خوش خیال لوگ ابھی تک سفر میں ہیں

محفل میں اُن کی سمت نگاہیں نہ اُٹھ سکیں
ہم بالخصوص اہلِ نظر کی نظر میں ہیں

اقبالؔ ہم کو اپنے عدو سے گلہ نہیں
ہم بھی خدا کا شکر کسی کی نظر میں ہیں

تم سے کس نے کہا، میں نے شکوہ کیا؟ خیر جس نے کہا اور جو بھی کہا، کہنے والا غلط فہم و نادان ہے
ہاں کبھی ازرہِ تذکرہ بے خیالی میں ضمناً کوئی بات کہہ دوں یونہی، وہ بھی احباب میں اس کا امکان ہے

ہم جو بھولے سے بھی مسکرائے کبھی، اُن کے ماتھے پہ بل پڑ گئے سیکڑوں، جیسے خوشیاں فقط اُن کی میراث ہیں
یوں بظاہر ملاقات برسوں کی ہے، دل نوازی بھی ہے غمگساری بھی ہے، یعنی اچھی طرح جان پہچان ہے

آگ شعلوں پہ شعلے اُگلتی رہی، باغ چیخا کیا، پھول روتے رہے، لوگ دیکھا کیے اور ہنستے رہے
کوئی سوچے ذرا خود ہی انصاف سے، ایسے حالات میں، ایسے ماحول میں، حفظِ ناموسِ گلشن کا امکان ہے؟

عمر بھر کی وفاؤں کی قیمت ہے یہ؟ یا خلوص و محبت کا انعام ہے؟ ایک چھوٹی سی لغزش پہ برہم ہو تم!
ایک شکوے پہ اتنے خفا ہو گئے! یہ نہ سمجھا مرے دل کا عالم ہے کیا، یہ نہ سوچا کہ انسان انسان ہے

اے مرے دوستو! اے مرے مشفقو! بے زبانی کا مفہوم یہ کب ہوا، تلخ و شیریں کا احساس مجھ کو نہیں؟
یہ الگ بات ہے باوجودِ ستم اپنے دشمن کو بھی میں نہ دشمن کہوں، مجھ کو اپنے پرائے کی پہچان ہے

روٹھے روٹھے سے تم، سہمے سہمے سے ہم، اجنبی اجنبی سے ملے جس طرح، ایسے ملنے سے اچھا نہ ملنا ہی تھا
خیر یہ بھی بہت ہے ہمارے لئے کم سے کم باریابی تو حاصل ہوئی، آپ کی یہ نوازش ہے احسان ہے

کس کی محفل ہے یہ ہم کہاں آ گئے؟ اِن میں اقبالؔ کوئی شناسا بھی ہے؟ کس سے باتیں کریں کس کو آواز دیں
اُن کے چہرے پہ شاید نقابیں بھی ہیں، آستینوں کے اندر چمکتا ہے کچھ، ایسی محفل میں اندیشۂ جان ہے

ہر شخص جب سے شہر میں فرزانہ ہوگیا
دیوانہ ضد میں اور بھی دیوانہ ہوگیا

رندوں نے بھی ضمیر فروشی شعار کی
اِک ایسا شخص ساقیِ میخانہ ہوگیا

ساقی کے پائے ناز پہ سجدے کیے گئے
لو میکدہ بھی خیر سے بُت خانہ ہوگیا

رندوں کی کائنات فقط اُن کا ظرف تھا
سو وہ بھی نذرِ سازشِ میخانہ ہوگیا

جی چاہتا ہے چھین لیں ساقی سے میکدہ
لبریز اب تو صبر کا پیمانہ ہوگیا

○

جس انجمن میں دیکھو بیگانے رہ گئے ہیں
گنتی کے لوگ جانے پہچانے رہ گئے ہیں

کہنے کو داستانیں برباد محفلوں کی
اب چند پَر شکستہ پروانے رہ گئے ہیں

کل جن حقیقتوں سے ماحول معتبر تھا
آج اُن حقیقتوں کے افسانے رہ گئے ہیں

ویران میکدوں میں رندوں کی یادگاریں
لے دے کے کچھ شکستہ پیمانے رہ گئے ہیں

ایک ایک کر کے رخصت ہوتے گئے یگانے
اب غم گُساریوں کو بیگانے رہ گئے ہیں

اب ذوقِ بندگی کو سجدوں میں کیا ملے گا
پتھر کی مورتوں کے بُت خانے رہ گئے ہیں

تاریخِ عہدِ رفتہ بالاختصار یہ ہے
گلشن جہاں جہاں تھے ویرانے رہ گئے ہیں

اب غارتِ چمن میں کیا رہ گیا ہے باقی
کچھ پیرہن دریدہ دیوانے رہ گئے ہیں

اقبالؔ ڈھونڈھتے ہو تم جن کو محفلوں میں
اُن کی جگہ اب اُن کے افسانے رہ گئے ہیں

○

اگر انسان کا ذوقِ نظر بیدار ہو جائے
نقاب اُٹھے نہ اُٹھے، رُوبرو دیدار ہو جائے

نظر محروم ہو جائے اگر ذوقِ تماشا سے
اندھیرا تو اندھیرا، روشنی بھی بار ہو جائے

وہ منزل نقطۂ آغاز ہے مرگِ مسلسل کا
خود اپنی ذات سے جب آدمی بیزار ہو جائے

یہی جی چاہتا ہے اب گریباں چاک کر ڈالیں
جو ہونا ہے تو رسوائی سرِ بازار ہو جائے

کرم کا آسرا اک خود فریبی ہی سہی، لیکن
جو اِتنا بھی نہ ہو تو زندگی دشوار ہو جائے

خدا محفوظ رکھے اُس گھڑی سے میری غیرت کو
کہ دشمن بھی ترس کھا کر مرا غمخوار ہو جائے

محبت کو سلیقہ ہو اگر حُسنِ تکلم کا
جو آنسو آنکھ سے ٹپکے، لبِ اظہار ہو جائے

O

جب راس ہی نہ آیا گلشن کا آب و دانہ
تو کیسا آشیانہ اور کس کا آشیانہ

اب کتنے مُختصر ہیں آداب دوستی کے
سُنتے رہو فسانہ، کہتے رہو فسانہ

ہر چند زندگی کی قدریں بدل چکی ہیں
اہلِ وفا سے اب بھی خالی نہیں زمانہ

اب جُرمِ خودکُشی بھی محفوظ ہے سزا سے
ہے کتنا خوبصورت تقدیر کا بہانہ

یہ دل کا بوجھ ہم کو خود بھی نہیں گوارا
لیکن سوال یہ ہے کس سے کہیں فسانہ

○

ہم کہاں جراُتِ سوال کہاں
جاں نثاروں کی یہ مجال کہاں

اُن کی محفل میں حکم چلتا ہے
التجا کا وہاں سوال کہاں

چلتے پھرتے نگار خانے ہیں
اِس زمانے میں خوش جمال کہاں

چھین لیں مجھ سے روشنی میری
اِن اندھیروں کی یہ مجال کہاں

انجمن میں نقاب پوشوں کی
دوست تو ہیں، شریکِ حال کہاں

میں ہی مجبور ہوں طبیعت سے
آپ کو خود مرا خیال کہاں

شاعری کام آگئی اقبالؔ
ورنہ امکانِ عرضِ حال کہاں

نہ جانے فرطِ محبت میں اُن سے کیا کہہ دیں
ہم اِس خیال سے رودادِ غم سنا نہ سکے

ہم، اور آپ پہ تنقید، وہ بھی غیروں میں
ہم اپنے زخم تو اپنوں کو بھی دکھا نہ سکے

ہمیں کسی سے گلہ تھا نہ ہے، نہ اب ہوگا
یہ اور بات ہے تم یقین آ نہ سکے

وہ بزمِ غیر تھی، یہ تو خیال کر لیتے
ذرا سی دیر کو تم برہمی چھپا نہ سکے

وہ لوگ گردشِ دوراں کا ساتھ کیا دیں گے
جو اپنی تیرہ نصیبی پہ مسکرا نہ سکے

اپنا گھر چھوڑ کے ہم لوگ وہاں تک پہنچے
صُبحِ فردا کی کرن بھی نہ جہاں تک پہنچے

میں نے آنکھوں میں چُھپا رکھّے ہیں کچھ اور چراغ
روشنی صبح کی شاید نہ یہاں تک پہنچے

بے کہے بات سمجھ لو تو مناسب ہوگا
اِس سے پہلے کہ یہی بات زباں تک پہنچے

تم نے ہم جیسے مسافر بھی نہ دیکھے ہوں گے
جو بہاروں سے چلے اور خزاں تک پہنچے

آج پندارِ تمنّا کا فسوں ٹوٹ گیا
چند کم ظرف گِلے نوکِ زباں تک پہنچے

○

تم نے دل کی بات کہہ دی آج، یہ اچھا ہوا
ہم تمھیں اپنا سمجھتے تھے، بڑا دھوکا ہوا

جب بھی ہم نے کچھ کہا، اُس کا اثر اُلٹا ہوا
آپ شاید بھول جاتے ہیں، بارہا ایسا ہوا

اور ہم کرتے بھی کیا، ترکِ تعلّق کے سوا
ہم کو خود حیرت ہے، یہ بیٹھے بٹھائے کیا ہوا

اب بھی باقی ہے تمھارے دل میں تھوڑا سا خلوص
اِس سے پہلے بھی ہمیں اکثر یہی دھوکا ہوا

آپ کی آنکھوں میں یہ آنسو کہاں سے آگئے
ہم تو دیوانے ہیں لیکن آپ کو یہ کیا ہوا

اِس شکر رنجی سے کیا حاصل ہوا، خود سوچیے
آپ بھی رسوا ہوئے، ناچیز بھی رسوا ہوا

اب کسی سے کیا کہیں اقبالؔ اپنی داستاں
بس خدا کا شکر ہے، جو کچھ ہوا اچھا ہوا

○

خواب کو حیلہ بنا کر اک غلط تعبیر کا
لوگ رونا رو رہے ہیں آج تک تقدیر کا

کس قدر آسان ہے توجیہِ فردِ جرم کی
کچھ زمانے کی شکایت کچھ گلہ تقدیر کا

کوئی مردِ کوہکن اٹھتا ہے جب تیشہ بدوش
جوئے خوں سے کام لے لیتا ہے جوئے شیر کا

جب کبھی بیدار ہو جاتا ہے پندارِ جنوں
ٹوٹ جاتا ہے تکبّر حلقۂ زنجیر کا

ایسے بھولے لوگ بھی زندہ ہیں دنیا میں ابھی
جو خوشی سے مان لیتے ہیں کہا تقدیر کا

میرے زخموں کو نہ چھیڑیں آپ بس یہ دیکھ لیں
خیر مقدم ہو رہا ہے آپ کے ہر تیر کا

آپ کی سنجیدگی کے ہم بھی قائل ہو گئے
سر سے پا تک ہو بہو انداز ہے تصویر کا

آپ اب آئے ہیں جب بیمار رُخصت ہو چکا
آپ سے اب کون پوچھے گا سبب تاخیر کا

شعر میں اقبالؔ لازم ہے زبان و فن کے ساتھ
فکر غالبؔ کی، خلوص اقبالؔ کا، غم میرؔ کا

○

جو ہوسکے تو خزاں سے مصالحت کر لو
چمن کے لوگو! بہاروں کا اعتبار نہیں

کنارے موج و تلاطم کی خواب گاہیں ہیں
سفینے والو، کناروں کا اعتبار نہیں

پلک جھپکتے بدلتا ہے رُخ ہواؤں کا
نگاہ والو، نظاروں کا اعتبار نہیں

سہارا آپ کا، بے شک بڑا سہارا ہے
مگر حضور، سہاروں کا اعتبار نہیں

سُنے تو کون سُنے دل کا ماجرا اقبالؔ
شکستہ ساز کے تاروں کا اعتبار نہیں

○

چھیڑا ہے سرِ شام کہیں ساز کسی نے
یا دُور سے دی ہے مجھے آواز کسی نے

ٹوٹے ہوئے تاروں کو ابھی جوڑ رہا تھا
ہاتھوں سے مرے چھین لیا ساز کسی نے

اِک آہ تو کر لی ہے مگر، سوچ رہا ہوں
پہچان نہ لی ہو مری آواز کسی نے

ہم کر نہ سکے جراُتِ اظہارِ تمنا
اِس طرح کیا بات کا آغاز کسی نے

غیروں پہ عنایات ہیں اپنوں سے شکایات
سمجھے نہ کبھی آپ کے انداز کسی نے

توبہ کی جبیں پر ہے ندامت کا پسینہ
رندانہ اُٹھائی نگہِ ناز کسی نے

اقبالؔ یہ آنسو بھی امانت ہیں کسی کی
پایا نہ غمِ دوست کا یہ راز کسی نے

○

پردے ہی پردے میں شرحِ آرزو ہوتی رہی
رات اُن سے غائبانہ گفتگو ہوتی رہی

جیسے جیسے حادثے دادِ سفر دیتے رہے
ویسے ویسے اور محکم، جستجو ہوتی رہی

جیب و دامن کی برابر دھجّیاں اُڑتی رہیں
لاکھ دیوانوں میں تبلیغِ رفو ہوتی رہی

اذنِ توبہ، بابِ توبہ سے صدا دیتا رہا
اور جواباً خاطرِ جام و سبو ہوتی رہی

لوگ ناکامی کا ماتم برملا کرتے رہے
اور شرحِ آیۂ لَاتَقنَطُو ہوتی رہی

میری معذوری پہ دشمن بھی ترس کھاتے رہے
یوں سرِ بازار رُسوا آبرو ہوتی رہی

دوستی سے ہم جوابِ دشمنی دیتے رہے
اس طرح اقبالؔ! تادیبِ عدو ہوتی رہی

○

خزاں کے بعد چمن میں اماں ملے نہ ملے
جہاں ہے آج نشیمن وہاں ملے نہ ملے

خدا کا شکر کہ ہم تو قریب آ پہنچے
کسی کو منزلِ عمرِ رواں ملے نہ ملے

سفر کا ساتھ تو ویسے بھی کوئی ساتھ نہیں
کوئی رفیق، کوئی کارواں ملے نہ ملے

نظر نظر سے بیاں کر رہی ہے افسانہ
پھر اس کے بعد کوئی ہم زباں ملے نہ ملے

غزل کی روح میں رقصاں ہے داستانِ حیات
کسی کو سلسلۂ داستاں ملے نہ ملے
ق
یہ بات بات میں خوشبو شگفتہ پھولوں کی
یہ خوشگوار فضا، یہ سماں ملے نہ ملے

یہاں سے جائیں کہاں ہم خلوص کے مارے
کہیں یہ انجمنِ دوستاں ملے نہ ملے

○

غمِ شکست طبیعت کو ناگوار سا ہے
مجھے کچھ اپنے عزائم پہ اعتبار سا ہے

غمِ حیات کبھی تھا غمِ حیات، مگر
غمِ حیات پہ اب مجھ کو اختیار سا ہے

یہ رات ڈھل کے رہے گی سحر میں دیر نہیں
نہ جانے کیوں مجھے فردا پہ اعتبار سا ہے

بہت قریب ہے شاید جلوسِ فصلِ بہار
کہ غنچہ غنچہ گلستاں میں بے قرار سا ہے

طلوعِ مہر کے لمحے قریب آ پہنچے
نجومِ شب کی جبینوں پہ انتشار سا ہے

نفس نفس پہ یہ محسوس ہو رہا ہے مجھے
نگاہِ وقت کو جیسے کچھ انتظار سا ہے

اُٹھو کہ خواب کے لمحے گزر چکے اقبالؔ
نمودِ صبح ہے ماحول سازگار سا ہے

○

آج کل سچ پوچھیے تو مسکراتا کون ہے
خود فریبی ہے فقط، ہنستا ہنساتا کون ہے

میری نیندیں اُڑ گئی ہیں یہ تو کہہ سکتا ہوں میں
یہ مگر مت پوچھیے نیندیں اُڑاتا کون ہے

تم نہیں آتے نہ آؤ، تم سے شکوہ بھی نہیں
تم سے کہتا کون ہے، تم کو بُلاتا کون ہے

تم نہیں سُنتے اگر افسانۂ غم، مت سنو
ہر کس و ناکس کو افسانہ سُناتا کون ہے

اس سے پہلے بھی کیا ہے ہم نے اُن کا اعتبار
ایسے وعدے تو بہت ہوتے ہیں آتا کون ہے

اُن کی محفل دیکھنے کا شوق تو ہم کو بھی ہے
ہم وہاں جاتے، مگر ہم کو بُلاتا کون ہے

فتنہ ہائے دہر کے اقبالؔ شاکی ہیں سبھی
اِن سے یہ پُوچھے کوئی فتنے جگاتا کون ہے

○

دَور میں اوروں کی خاطر پیمانوں پر پیمانے ہیں
سارے میخانے میں جیسے اِک ہم ہی بیگانے ہیں

مدّت کے اِس ساتھ پہ بھی بیگانے کے بیگانے ہیں
دُنیا والے پاگل ہیں، یا ہم ہی کچھ دیوانے ہیں

کس نے کس کا ساتھ دیا ہے، سب جانے پہچانے ہیں
بیگانوں کو کیا کہیے، جب اپنے بھی بیگانے ہیں

ہم نے اِن دو آنکھوں سے مت پُوچھو کیا کچھ دیکھا ہے
اِن سچّی باتوں کو اب تم سمجھو گے افسانے ہیں

وقت کے ہاتھوں اُجڑا ہے یُوں خوشیوں کا شاداب چمن
پیشِ نظر تا حدِّ نظر ویرانے ہی ویرانے ہیں

دل کے ویرانے میں اب بھی کچھ کچھ رونق باقی ہے
ارمانوں کے تاج محل ہیں، یادوں کے بُت خانے ہیں

چاک گریباں والوں کو اقبالؔ کوئی کیا سمجھے گا
فرزانوں کے فرزانے ہیں، کہنے کو دیوانے ہیں

○

آنکھوں سے بے ارادہ آنسو ٹپک گئے ہیں
یہ جام، بے سبب بھی، اکثر چھلک گئے ہیں

جب جرأتِ بیاں نے چھوڑا ہے ساتھ میرا
پلکوں سے کچھ فسانے خود ہی ڈھلک گئے ہیں

غُربت میں تیرا دامن جب یاد آگیا ہے
فکر و نظر کی حد تک جادے چمک گئے ہیں

جس جس روش سے ہو کر کوئی گزر گیا ہے
گلشن تو پھر ہیں گلشن، صحرا مہک گئے ہیں

رندانہ اُٹھ گئی ہیں جس سمت وہ نگاہیں
ماحول کی جبیں سے سجدے ٹپک گئے ہیں

اب کون سی زباں میں ہم گفتگو کریں گے
آہیں بھی تھک گئی ہیں آنسو بھی تھک گئے ہیں

ساغر بکف نگاہیں، مینا بدوش گیسو
اِن میکدوں میں اکثر تقوے بہک گئے ہیں

○

ہم تو رسوا ہوئے، وفا کر کے
آپ کو کیا ملا، جفا کر کے

یوں ہی نادم تھے ہم خطا کر کے
اور نادم ہوئے، دعا کر کے

وہ بھی محجوب، ہم بھی شرمندہ
فائدہ کیا ہوا، گلہ کر کے

آج تک ہے شکست کا احساس
آپ سے عرضِ مدّعا کر کے

خود فریبی مزاج ہے اُن کا
کیا کریں اُن سے التجا کر کے

شاید اُن کی سمجھ میں آجائے
دیکھ لیں یہ بھی تجربہ کر کے

گھر میں کس عافیت سے بیٹھے ہیں
ساری دنیا کو ہم خفا کر کے

○

شعلہ سا ایک شرق میں رقصاں ہوا تو تھا
کچھ رونقِ حیات کا ساماں ہوا تو تھا

پھوٹی تو تھی شفق سے کرن آفتاب کی
کچھ کامیاب خونِ شہیداں ہوا تو تھا

آ کر قریب لوٹ گئی صبحِ زندگی
کچھ اعتبارِ گردشِ دوراں ہوا تو تھا

دیکھی پھر اِس کے بعد نہ آنکھوں نے روشنی
اک رات غمکدے میں چراغاں ہوا تو تھا

اہلِ چمن نے آگ لگا دی بہار میں
ورنہ کچھ اہتمامِ بہاراں ہوا تو تھا

ظلمت کدوں نے دُور سے دیکھی تھی روشنی
عشرت کدوں میں رات چراغاں ہوا تو تھا

زندانیوں کو راس نہ آئی بہارِ نو
وا موسمِ بہار میں زنداں ہوا تو تھا

○

نظر نظر میں جگا دی ہے روشنی ہم نے
نفس نفس میں سمو دی ہے نغمگی ہم نے

کلی کلی کو دیا ہے سبق تبسم کا
روش روش پہ بچھا دی ہے تازگی ہم نے

فسردہ حال سہی ہم، خزاں نصیب سہی
ترے چمن کو عطا کی ہے زندگی ہم نے

بُجھا کے آئے ہیں ہم اپنی محفلوں کے چراغ
بکھیر دی ہے ترے گھر میں چاندنی ہم نے

گزر کے آنا پڑا اشک و خوں کی موجوں سے
ادا کیا ہے مگر حقِّ دوستی ہم نے

ترا مزاج مگر اب بھی ہم سے برہم ہے
نہ جانے کون سی کی ایسی دشمنی ہم نے

خدا کی شان اُنھیں زعمِ رہنمائی ہے
جنھیں سکھائے تھے آدابِ رہ روی ہم نے

ہماری خانہ خرابی کو دائمی نہ سمجھ
قسم خدا کی کبھی کی ہے خسروی ہم نے

چُھٹا جو ہاتھ ہمارا تو مِل چکی منزل
بُرا نہ مان حقیقت بیان کی ہم نے

○

اِس زمانے کے بے کیف ماحول میں، ذکرِ رعنائیٔ چشم و ابرو کہاں
اب حقائق سے دوچار ہے زندگی، مہلتِ فکرِ رُخسار و گیسو کہاں

اب پرستش کے انداز کچھ اور ہیں، اور پرستش کا مقصد بھی کچھ اور ہے
اب تو بازار ہے اور خریدار ہیں، اب محبت میں اخلاص کی بُو کہاں

تذکرہ جب بھی میرا کیا جائے گا، آپ کا نام بھی بیچ میں آئے گا
آپ ہر چند دامن بچاتے رہیں، عشق میں امتیازِ من و تُو کہاں

میں نے رُو رُو کے افسانۂ دل کہا، اور توجہ سے اُس کو سُنا بھی گیا
شوقِ قربت کو اب اور کیا چاہیے، اُن کا دامن کہاں میرے آنسو کہاں

پہلے دِلّی چُھٹی، پھر چُھٹا لکھنؤ، لطفِ صحبت ہی اقبالؔ جاتا رہا
اب وہ باتوں میں پھولوں کی خوشبو کہاں اب وہ شیرینیٔ قندِ اردو کہاں

○

مجھے شکوہ ہے اپنی چشمِ تر سے
گرا جاتا ہوں خود اپنی نظر سے

دعائیں مانگتے ہیں جو سحر کی
وہ ناواقف ہیں انجامِ سحر سے

ابھی سے لوگ پتّھر چُن رہے ہیں
نہ جانے کون گزرے گا، اِدھر سے

وہاں اب سیکڑوں دانش کدے ہیں
کبھی دیوانے گزرے تھے جِدھر سے

کوئی روزن ہی زنداں میں نہیں ہے
چلو، فرصت ملی فکرِ سحر سے

میں اہلِ کارواں سے پوچھتا ہوں
مِلا کیا اِس غلط عزمِ سفر سے

مقدّر ہوگئی، خانہ بدوشی
نہ جانے کس گھڑی نکلے تھے گھر سے

اب اِسے کیا کرے کوئی، آنکھوں میں روشنی نہیں
شہر بھی اجنبی نہیں، لوگ بھی اجنبی نہیں

یوں تو بڑے خلوص سے، لوگ ہوئے ہیں ہم سفر
راہ میں ساتھ چھوڑ دیں، اُن سے بعید بھی نہیں

بیتے ہوئے خوشی کے دن، بھولی ہوئی کہانیاں
آپ کو یاد ہوں تو ہوں، ہم کو تو یاد بھی نہیں

اپنی اِسی زمین پر بستے ہیں ایسے لوگ بھی
جن کے گھروں میں آج تک، صبح کبھی ہوئی نہیں

ترکِ تعلّقات تک، بات اگر پہونچ گئی
اُس کو کچھ اور کہتے ہیں، صرف وہ برہمی نہیں

○

اُٹھ جاتے ہیں جب چہرۂ ماضی سے حجابات
افسانوں میں ڈھل جاتے ہیں، گزرے ہوئے لمحات

یاد آتی ہے جب عہدِ محبت کی شروعات
آنکھوں سے لہو بن کے چھلک جاتے ہیں جذبات

وہ باتوں ہی باتوں میں، کبھی حرف و حکایات
وہ آنکھوں ہی آنکھوں کبھی رمز و کنایات

بے لفظ و بیاں، کوششِ اظہارِ خیالات
بے جنبشِ لب، نظروں ہی نظروں میں پیامات

کچھ اُن کو شکایات، تو کچھ مجھ کو شکایات
وہ زندۂ جاویدِ محبت کی روایات

دنیا کو دکھانے کے لئے مجھ پہ عتابات
در پردہ مگر سلسلۂ پرسشِ حالات

بھیگی ہوئی پلکوں پہ اِدھر چند سوالات
اور ایک تبسّم میں، اُدھر لاکھ جوابات

لیکن وہ نظر اور وہ الطاف و عنایات
اب میرے لئے ہوگئیں، پارینہ حکایات

کچھ اور ہیں اب میری محبّت کے مقامات
اب فکرِ عنایات، نہ احساسِ عتابات

اقبالؔ اِسے کہتے ہیں، نیرنگیٔ اوقات
اب صبح ہے وہ صبح، نہ اب رات ہے وہ رات

○

ہر چند ہم کو تشنہ لبی ناگوار تھی
ساقی سے ہم ضمیر کا سودا نہ کر سکے

سمجھا گیا ہمیں بھی توجّہ کا مستحق
اتنی سی بات لوگ گوارا نہ کر سکے

اُن دوستوں سے مجھ کو خصوصی لگاؤ ہے
میرے خلوص پر، جو بھروسا نہ کر سکے

وہ زخمِ دل ہے، زخم نصیبوں کی کائنات
جس زخمِ دل کا کوئی مُداوا نہ کر سکے

شکوے پہ اُن کو حُسنِ طلب کا گماں نہ ہو
ہم اِس خیال سے، کبھی شکوہ نہ کر سکے

ملتی ہے اُن گھروں سے چراغوں کو روشنی
سورج بھی جن گھروں میں اُجالا نہ کر سکے

اقبالؔ، اُن سے بات تو کہہ دی کسی طرح
لیکن پھر اس کے بعد، تقاضا نہ کر سکے

○

ہے بپا دل میں حشرِ تلاطم
پھر بھی جاری ہے شغلِ تبسم

خیر مقدم غمِ زندگی کا
ایک بار اور سعیِٔ تبسم

حوصلے دل کے کم ہو نہ پائیں
اِک تبسم برائے تبسم

آنکھ نم اور ماتھے پر شکنیں
اللہ اللہ یہ حسنِ تکلم

عمرِ رفتہ نے بھی مُڑ کے دیکھا
جب ملے ہیں سرِ راہ ہم تم

پھر پلٹ کر نہ آئے وہ لمحے
ہائے وہ اتفاقی تصادم

اتنی فرصت بھی کچھ کم نہیں ہے
پھر نہ جانے کہاں ہم کہاں تم

○

جب دل پہ گراں گزری ماحول کی خاموشی
بھولی ہوئی یادوں سے ہونے لگی سرگوشی

جب زخم کوئی کھایا، ہم شکر بجا لائے
ہم سے تو نہیں ہوتی احسان فراموشی

آغازِ محبّت کا انجام تو ظاہر تھا
ممکن ہی نہ تھی لیکن انجام سے رُو پوشی

جس غم کو محبّت کی سرکار سے نسبت ہو
توہینِ عقیدت ہے اُس غم سے سبک دوشی

یہ ربطِ خصوصی ہے پہچان محبّت کی
اک سمت وفا کیشی، اک سمت جفا کوشی

○

کبھی جو کی گئی کوشش بھی مسکرانے کی
بدل گئی ہیں نگاہیں وہیں زمانے کی

قفس کے لوگو! قفس کا مقام پہچانو
قفس سے راہ نکلتی ہے آشیانے کی

یہ کس کے شہر میں بھولے سے آگئے ہم لوگ
نہ گفتگو کی اجازت نہ مسکرانے کی

چمن کے لوگوں سے دیکھیں نباہ ہو کہ نہ ہو
بِنا تو ہم نے بھی ڈالی ہے آشیانے کی

سبھی نے راہ میں اقبالؔ ساتھ چھوڑ دیا
رہیں شریکِ سفر گردشیں زمانے کی

○

چراغ روشن ہیں انجمن میں فضا ہے لیکن بجھی بجھی سی
شراب شیشوں میں ڈھل رہی ہے، لبوں پہ ہے پھر بھی تشنگی سی

شریکِ محفل ہیں یوں تو ہم بھی مگر باندازِ خود فریبی
مزاجِ محفل بھی اجنبی سا، نگاہِ ساقی بھی اجنبی سی

عجیب منزل پہ آکے ٹھہرے ہیں راہِ امروز کے مسافر
نگاہِ ماضی میں برہمی سی، جبینِ فردا پہ تیرگی سی

فریبِ منزل کا راز افشا ہوا ہے آکر قریبِ منزل
نظر تو آئی تھی دور سے کچھ سوادِ منزل پہ روشنی سی

شکست کھائی ہے زندگی نے خود اپنے عزمِ غلط کے ہاتھوں
قدم بظاہر تو بڑھ رہے ہیں مگر بہ باطن ہے بے دلی سی

پڑا ہے وہ وقت آدمی پر کہ قلبِ فطرت بھی مضمحل ہے
زمیں کی سانسیں تھکی تھکی سی فلک کی نبضیں رُکی رُکی سی

بہار ہے یہ، خزاں نہیں ہے، سمجھ رہے ہیں یہ ہم بھی، لیکن
قدم قدم پر کھٹک رہی ہے فضائے گلشن میں کچھ کمی سی

نقاب پوشوں کی انجمن میں حقیقتیں یوں چھپی ہوئی ہیں
دِلوں میں شعلے بھڑک رہے ہیں، مگر بظاہر ہے دوستی سی

کسی کو اقبالؔ کیا خبر ہے کہ دل پہ کیا کچھ گزر رہی ہے
ہنسی سمجھتی ہے اس کو دنیا، لبوں پہ کچھ ہے جو کپکپی سی

○

اب آہ بھی سینے سے نکلتی ہے بہ مُشکل
یہ صورتِ حالات بدلتی ہے بہ مُشکل

تسلیم کہ اک شمع کی ضَو کم ہے، بہت کم
اِک شمع بھی ظلمات میں جلتی ہے بہ مُشکل

اس درد کا درماں کوئی آسان نہیں ہے
وہ پھانس ہے دل میں جو نکلتی ہے بہ مُشکل

تدبیر کی عظمت مجھے تسلیم ہے، لیکن
تدبیر سے تقدیر بدلتی ہے بہ مُشکل

جو رات کبھی رشکِ سحر تھی ترے دم سے
وہ رات ترے ہجر میں ڈھلتی ہے بہ مُشکل

جو بات کہی جائے محبّت کی فَضا میں
وہ بات کسی دل سے نکلتی ہے بہ مُشکل

اقبالؔ طبیعت کو یہ کیا ہوگیا آخر
اب شدّتِ غم سے بھی بہلتی ہے بہ مُشکل

بے کیف سہی، بے رنگ سہی، افسانۂ غم مُبہم ہی سہی
پلکیں تو ہیں نم کچھ آپ کی بھی، تاثیر تو ہے کم کم ہی سہی

جب سامنے تم آجاتے ہو، کچھ مُنہ سے نکل ہی جاتا ہے
تم سے نہ کہیں تو کس سے کہیں، تم اپنی جگہ برہم ہی سہی

کچھ اہلِ وفا اس دنیا میں یادوں کے سہارے زندہ ہیں
جو دَورِ محبت رُوٹھ چکا، اُس دَور کا اب ماتم ہی سہی

تقدیر میں جو لکھا تھا ہوا، بس جانے بھی دو کیا ذکر اُس کا
اب وجہِ تباہی کوئی بھی ہو، وہ تم نہ سہی وہ ہم ہی سہی

یہ آگ سُلگتی یوں کب تک، گُھٹ گُھٹ کے کہاں تک رہتے ہم
کچھ جی تو ہوا ہلکا ہلکا، اک گوشۂ داماں نم ہی سہی

اِک عرضِ تمنّا کی خاطر نظروں سے کسی کی کیوں گرتے
ہم ترکِ تمنّا کر بیٹھے، قسمت میں غمِ پیہم ہی سہی

شکوہ جو زباں پر آ ہی گیا، کیا آن رہی خودداری کی
تقدیر پہ شاکر ہے اپنی، اقبالؔ سراپا غم ہی سہی

○

تری نگاہ کی ہر جنبشِ حجابانہ
تمام ساغر و مینا تمام میخانہ

ترا تبسمِ معصوم شعر و افسانہ
تری نگاہ غزل اور غزل بھی رندانہ

نظر نظر میں کسی سے کسی کا افسانہ
بیاں ہوا ہے سرِ بزم رازدارانہ

قدم قدم پہ مُرتّب ہوا ہے افسانہ
جدھر جدھر سے گزرتا گیا ہے دیوانہ

نظامِ قلب و نظر اب ہے آئینہ خانہ
کوئی قریب سے گزرا ہے بے حجابانہ

مرے تصوّرِ رنگیں میں کوئی یوں آیا
چمن میں جیسے چلی آئے شامِ میخانہ

چُھٹا ہے ہاتھ سے دامن کسی کا یوں اقبالؔ
لبوں تک آ کے چھلک جائے جیسے پیمانہ

تم اسی طرح ہم سے جو برہم رہے، رُخ ہواؤں کے دیکھو بدل جائیں گے
زندگی کی بہاریں گزر جائیں گی، اور یہ لمحے فسانوں میں ڈھل جائیں گے

آپ سے ہم کو بے شک بہت اُنس ہے، ہم مگر اپنے پندار کو کیا کریں
اپنی توہین ہم کو گوارا نہیں، آپ بدلے تو ہم بھی بدل جائیں گے

آپ ہونٹوں کو جُنبش کی زحمت تو دیں، کم سے کم دل کو تسکین ہو جائے گی
ہم مزاجاً بڑے سادہ دل لوگ ہیں، جھوٹے وعدوں سے بھی ہم بہل جائیں گے

ہمسفر یوں تو اپنے بھی کچھ کم نہیں، اور بظاہر سبھی اہلِ اخلاص ہیں
لیکن انجان لوگوں کا کیا ٹھیک ہے، وقت کے ساتھ یہ بھی بدل جائیں گے

ساتھ خانہ خرابوں کا اچھا نہیں، آپ لِلّٰہ واپس چلے جائیے
اس بیاباں کی تپتی ہوئی ریت پر، آپ کے پھول سے پاؤں جل جائیں گے

وقت کی رَو بہت تیز ہے دوستو، اک ذرا آنکھ جھپکی اگر راہ میں
شوقِ منزل غباروں میں کھو جائے گا، اور منزل کے تیور بدل جائیں گے

بات پہلے جہاں تھی وہیں ہے ابھی، اور اب بھی کہا جا رہا ہے یہی
صبح ہو جائے گی، دن نکل آئے گا، اور یہ پہرے اندھیروں کے ٹل جائیں گے

○

عین منزل پہ ہوئی شام، تو پھر کیا ہوگا
جستجو یوں ہوئی ناکام، تو پھر کیا ہوگا

شمعِ اُمّید جلائی تو ہے ڈرتے ڈرتے
بُجھ گئی یہ بھی سرِ شام، تو پھر کیا ہوگا

دامنِ صبر چُھٹا جاتا ہے ہاتھوں سے مرے
آ گیا لب پہ ترا نام، تو پھر کیا ہوگا

مجھ کو آغاز کی تلخی بھی گوارا، لیکن
ہو جو آغاز ہی انجام، تو پھر کیا ہوگا

مُسکراتے ہوئے ڈرتا ہوں کہ ہو یہ بھی اگر
سازشِ گردشِ ایّام، تو پھر کیا ہوگا

اس محبّت سے سرِ بزم مری سمت نہ دیکھ
ہاتھ سے چھوٹ گیا جام، تو پھر کیا ہوگا

پہلی منزل ہی پہ اقبالؔ یہ دل کا عالم
ایک منزل ہو بہ ہر گام، تو پھر کیا ہوگا

آپ میری طبیعت سے واقف نہیں، مجھ کو بے جا تکلف کی عادت نہیں
مجھ کو پُرسش کی پہلے بھی خواہش نہ تھی، اور پُرسش کی اب بھی ضرورت نہیں

یوں سرِراہ بھی پُرسشِ حال کی، اس زمانے میں فرصت کسی کو کہاں
آپ سے یہ ملاقات رسمی سہی، اتنی زحمت بھی کچھ کم عنایت نہیں

آپ اس درجہ افسُردہ خاطر نہ ہوں، آپ کوئی اثر اپنے دل پر نہ لیں
میں نے جو کچھ کہا اک فسانہ کہا، اور فسانے کی کوئی حقیقت نہیں

ایسی محفل میں شرکت سے کیا فائدہ، ایسے لوگوں سے کوئی توقع بھی کیا
جو کہا جائے خاموش سُنتے رہو، لب کُشائی کی قطعاً اجازت نہیں

نُکتہ چینی تو فطرت ہے انسان کی، کس کا شکوہ کریں، کس کو الزام دیں
خود ہمیں کون سے پارساؤں میں ہیں، ہم کو دنیا سے کوئی شکایت نہیں

مجھ کو معلوم ہے آپ مجبور ہیں، آپ میرے لئے مفت رُسوا نہ ہوں
ایسے حالات میں بے رُخی ٹھیک ہے، مجھ کو اس بات پر کوئی حیرت نہیں

کچھ یہ اقبالؔ ہی پر نہیں منحصر، سرگرانی مسلّط ہے ماحول پر
عقل و دانش کے بڑھتے ہوئے بوجھ سے، سر اُٹھانے کی دنیا کو فرصت نہیں

○

سب کو پیمانے پہ پیمانہ دیا
مجھ کو اِک اِک بوند کو ترسا دیا

میکدے والوں کی اس میں کیا خطا
ہم کو ساقی نے بڑا دھوکا دیا

دم گُھٹا جاتا ہے اِس ظلمات میں
شوقِ منزل نے کہاں پہنچا دیا

ہم نے اپنی بے محل تدبیر سے
اور بھی تقدیر کو اُلجھا دیا

زندگی کو بے وفا کہتے ہیں ہم
زندگی کو ہم نے لیکن کیا دیا

○

ایک مانوس سی خوشبو ہے فضا میں اب تک
پاس سے اُٹھ کے ابھی کوئی گیا ہو جیسے

رونقِ زیست سے کچھ یوں ہے تعلق مجھ کو
پھول گلشن میں تہہِ شاخ پڑا ہو جیسے

آدمی جان کے کھاتا ہے محبت میں فریب
خود فریبی ہی محبت کا صلہ ہو جیسے

ایک آنسو بھی بہاتے ہوئے جی ڈرتا ہے
مجھ کو در پردہ کوئی دیکھ رہا ہو جیسے

یوں زمانہ غمِ دوراں سے ڈراتا ہے مجھے
میرے حق میں غمِ دوراں بھی خدا ہو جیسے

...

○

وجہِ تخریبِ چمن ذہن ہے فرزانے کا
نام بدنام کیا جاتا ہے دیوانے کا

بات تو جب ہے کہ رندوں کا مقدّر بدلے
نام تو ہم بھی بدل سکتے تھے میخانے کا

ہر فسانہ ہے محبّت کا مزاجاً یکساں
صرف عنوان بدل جاتا ہے افسانے کا

نشّۂ ہونا ہے تو سَو طرح سے ہو سکتا ہے
اس میں کچھ دخل ہے ساقی کا نہ پیمانے کا

کام آتا ہے محبّت میں فقط اپنا خلوص
معتبر ساتھ یگانے کا نہ بیگانے کا

اس کے ہر ریزے میں پوشیدہ ہے غیرت کا وقار
ظرف دیکھے کوئی ٹوٹے ہوئے پیمانے کا

کم سے کم اُس کی عداوت میں تصنع تو نہیں
دل سے ممنون ہوں اقبالؔ میں بیگانے کا

○

غنچہ و گُل کے طلسمات، بہاروں کا فریب
تا بہ کَے کہنہ و فرسودہ سہاروں کا فریب

بارہا ٹوٹتا ہے اِس راہ میں پندارِ نظر
پھر بھی کھا جاتا ہے انسان نظاروں کا فریب

اُس کے انجام پہ تقدیر بھی رو دیتی ہے
جب بھی کھا جاتی ہے تدبیر سہاروں کا فریب

اس کے مُجرم ہیں نہ گرداب نہ طوفاں نہ قضا
کھا گیا ڈوبنے والوں کو کناروں کا فریب

جب سہاروں کی ضرورت تھی سہارے نہ ملے
اب دیا جاتا ہے بے وقت سہاروں کا فریب

○

رُخ بدل سکتی ہے تقدیرِ گلستاں اب بھی
جی رہے ہیں ترے کچھ چاک گریباں اب بھی

خاک کے ذرّے بھی دے سکتے ہیں لَو گام بہ گام
اسی ظلمات میں ممکن ہے چراغاں اب بھی

گر چکی ٹوٹ کے تلوار بھی ہاتھوں سے، مگر
حوصلہ وقت سے ہے دست و گریباں اب بھی

صبح کی پہلی کرن لائے گی پیغامِ حیات
اِسی زنداں میں ہے اِک روزنِ زنداں اب بھی

ہم حرم والے ہیں اقبالؔ ہمیں مت چھیڑو
سجدہ کرتی ہے ہمیں گردشِ دوراں اب بھی

○

غمِ ماضی سے بھی مانگے گئے کچھ منتخب لمحے
ہوا ہے بے بسی میں اہتمامِ زندگی یوں بھی

چھپانے کو فقط افسردگیٔ دل کی زمانے سے
ہنسی جاتی ہے مجبوری میں اکثر اِک ہنسی یوں بھی

غمِ جاناں بھی دیکھا ہے، غمِ دوراں بھی دیکھا ہے
عذابِ زندگی یوں بھی، عذابِ زندگی یوں بھی

یہ پیہم آزمائش کس لئے حُسنِ عقیدت کی
کہ ہے اہلِ وفا کو اعترافِ بندگی یوں بھی

تعلّق بے غرض اقبالؔ جب تک ہو تعلق ہے
کہ ممکن ہے اسی دُنیا میں رسمِ دوستی یوں بھی

○

ہم سے ہر موڑ پہ دُنیا نے عداوت کی ہے
پھر بھی ہم نے اِسی دُنیا سے محبّت کی ہے

یوں شکایت کا تمھیں حق ہے مگر سچ کہنا
ہم نے بھی تم سے کبھی کوئی شکایت کی ہے

ہم کو معلوم ہے اربابِ وفا کا انجام
ہم جہاں دیدہ ہیں ہم نے بھی محبّت کی ہے

دیکھیں کیا ملتا ہے اِس عرضِ تمنّا کا جواب
ہم نے بھی آج گزارش کی جسارت کی ہے

جس سے گھبراتے ہیں اقبالؔ! زمانے والے
ہم نے کس شوق سے اُس غم کی حفاظت کی ہے

○

دل میں محرومی کا غم، آنکھوں میں نم باقی نہیں
کوئی غم باقی نہیں، اب کوئی غم باقی نہیں

زندگی کی اور ساری تلخیاں باقی سہی
کم سے کم اندیشۂ چشمِ کرم باقی نہیں

حادثے معمول بن کر رہ گئے ہیں اِن دنوں
شُکر ہے اب زندگی میں پیچ و خم باقی نہیں

آنکھ مجبورِ تماشا، دل گریزانِ حیات
اب نگاہ و قلب میں ربطِ بہم باقی نہیں

عزمِ منزل کیا کرے کس سمت جائے زندگی
راہ میں اب معتبر نقشِ قدم باقی نہیں

پرسشِ احوال پر کس کس کو دوں کیا کیا جواب
اب وہاں ہوں میں جہاں کوئی الم باقی نہیں

اپنا سب کچھ لُٹ چکا اقبالؔ لیکن شکر ہے
اب کوئی خوفِ زیاں تو کم سے کم باقی نہیں.

○

مجھے لاکھ ہو بھروسہ مرے دل کا کیا ٹھکانا
کبھی بے نقاب ہو کر مرے سامنے نہ آنا

سرِ بزم تم خدارا مجھے یوں نہ آزمانا
مری سمت اس ادا سے کبھی اب نہ مُسکرانا

غمِ زندگی سے ممکن نہ ہوا نِباہ میرا
یہ کرم ہے تیرے غم کا مجھے اجنبی نہ جانا

ترے راز کا تحفظ مرے بس میں اب نہیں ہے
کہ نِکھر کے ہو گئی ہے مری ہر نظر فسانہ

یہ ہنسی، ہنسی نہیں ہے، یہ فریب ہے ہنسی کا
نہ اِسے سمجھ سکے تم، نہ سمجھ سکا زمانہ

کوئی تازہ حادثہ پھر مری راہ تک رہا ہے
مری سمت اُٹھ رہی ہے وہ نگاہِ دلبرانہ

ترے غم کی یادگاریں مرے شعر میری غزلیں
تری اک نظر کا حاصل مرا ذوقِ شاعرانہ

○

یہی آنسو بظاہر بے زباں بھی
یہی آنسو مفصّل داستاں بھی

تبسّم بھی، نگاہِ بدگماں بھی
تخاطب بھی، حجابِ درمیاں بھی

سلیقہ ہو اگر اہلِ قفس میں
یہی کُنجِ قفس ہے آشیاں بھی

یہی دل حسبِ رجحانِ محبّت
دیارِ کعبہ بھی، شہرِ بُتاں بھی

بہاروں کی اِفادت بھی مُسلّم
ضروری ہے مگر جشنِ خزاں بھی

○

جب طبیعت غمِ امروز سے گھبراتی ہے
یادِ ماضی مری پُرسش کو چلی آتی ہے

دل کی جب کوئی دبی چوٹ اُبھر آتی ہے
کتنے بھولے ہوئے افسانے سُنا جاتی ہے

تھی یہی زیست کبھی رشکِ بہارِ گلشن
اب اسی زیست پہ رہ رہ کے ہنسی آتی ہے

تلخیٔ زیست کے ہاتھوں ہے یہ عالم اپنا
اب ہنسی ہونٹوں پہ آتے ہوئے شرماتی ہے

جان پہچان نہ ہو جیسے کبھی کی ہم سے
یوں سحر پاس سے ہو ہو کے گزر جاتی ہے

ایک سجدے کی بھی فرصت نہیں مجھ کو اے دوست
یاد بھی تیری دبے پاؤں گزر جاتی ہے

مجھ کو شکوہ نہیں اقبالؔ غمِ دُنیا سے
زندگی اپنی خطاؤں کی سزا پاتی ہے

○

نہ مِنّت کسی کی، نہ شکوہ کسی سے
بسر ہو رہی ہے مگر بے دِلی سے

توقع بھی کیا ہو کسی کو، کسی سے
کہ بے زار ہے آدمی آدمی سے

ملیں تو نگاہیں نگاہوں سے لیکن
ملے جیسے اِک اجنبی اجنبی سے

شکایت کُجا، اور نادم ہوئے ہم
اُٹھائی گئی یوں نظر بے بسی سے

وہ ملنے کو ملتے تو ہیں ہم سے، لیکن
بڑی بے دلی سے، بڑی بے رُخی سے

○

بے لوث محبت کی ہم نے یہ سزا پائی
غیروں میں بھی رسوائی، اپنوں میں بھی رسوائی

اللہ رے یادوں کی یہ معجزہ فرمائی
ہنستا ہوا غم خانہ، مہکی ہوئی تنہائی

ماضی کے دھندلکوں سے یہ کس کی صدا آئی
ماحول کی رگ رگ میں بجنے لگی شہنائی

نغموں کی کرن پھوٹی مخمور نگاہوں سے
لَو دینے لگے لمحے، لی وقت نے انگڑائی

کچھ تلخ حقایق نے معمول بدل ڈالے
اپنوں سے کم آمیزی، غیروں سے شناسائی

یہ کون سا عالم ہے افسردہ مزاجی کا
گلشن میں بھی ویرانی، محفل میں بھی تنہائی

گلشن کی بہاروں میں شامل ہے لہو جن کا
وہ لوگ ہیں گلشن میں، اب صرف تماشائی

افسردہ چراغوں کی اشکوں نے جگہ لے لی
قسمت سے تلافی کی اک شکل نکل آئی

اقبالؔ جدھر دیکھو ظلمات کے پہرے ہیں
آساں طلبی ہم کو کس موڑ پہ لے آئی

○

گلشن گلشن جشنِ بہاراں فرزانوں کی قسمت میں
صحرا صحرا خارِ مُغیلاں دیوانوں کی قسمت میں

جام و سبُو سے نظمِ شبستاں ایوانوں کی قسمت میں
خونِ جگر سے سعیِ چراغاں غم خانوں کی قسمت میں

اپنی آگ میں جل بُجھنا ہے مسلک شمعِ فروزاں کا
محفل محفل رقصِ شہیداں پروانوں کی قسمت میں

اہلِ خرد کی تقدیروں میں محفل محفل جلوے ہیں
صرف طوافِ کُوچۂ جاناں، نادانوں کی قسمت میں

اندھی رسمیں جھوٹے وعدے دیر و حرم کا سرمایہ
عشوۂ ساقی، لغزشِ رنداں میخانوں کی قسمت میں

○

میں پوچھتا ہوں کہ یہ تیرگی بُری کیا ہے
جو مِل بھی جائے، تو مانگے کی روشنی کیا ہے

نہ مسکرائیں، نہ آنسو بہیں، نہ ہونٹ ہلیں
یہ زندگی ہے تو پھر اور خودکُشی کیا ہے

میں زندگی کو سہاروں پہ چھوڑ دوں کیسے؟
میں جانتا ہوں، مآلِ سپردگی کیا ہے

ہم اہلِ غم کی ہنسی کو ہنسی کا نام نہ دو
یہ زہرخند کی اک شکل ہے، ہنسی کیا ہے

غزل بہانہ ہے اقبالؔ، لب کُشائی کا
فسانۂ غمِ پنہاں ہے، شاعری کیا ہے

کل تک ہماری بات کوئی مانتا نہ تھا
اب سب یہ کہہ رہے ہیں کہ ماضی برا نہ تھا

اب اُن کے جی میں کیا ہے ہمیں یہ خبر نہیں
اندازِ گفتگو تو بہت مخلصانہ تھا

پرسش جو میری آپ نے کی اس کا شکریہ
لہجہ مگر حضور کا کچھ ناقدانہ تھا

ہم کو بیانِ حال کی جرأت نہ ہو سکی
ماحول اُن کے گھر کا بہت شاعرانہ تھا

ہجرت کو ہم نے منزلِ آخر سمجھ لیا
ورنہ یہ فیصلہ بھی غلط فیصلہ نہ تھا

اب اس کا کیا علاج کہ ہم خود ہیں گُل فروش
ورنہ اِسی چمن کے مقدر میں کیا نہ تھا

کل میکدے میں سب سے ملاقات ہو گئی
معلوم یہ ہوا کہ کوئی پارسا نہ تھا

○

شکایتیں ہوئیں، پُرسشِ ہوئی، سلام ہوئے
نظر، نظر سے ملی تو بہت سے کام ہوئے

روا روی میں بھلا اُن سے بات کیا ہوتی
وہ مُلتفت بھی ہوئے تو برائے نام ہوئے

جواب جب بھی ملا ہم کو بے رُخی سے ملا
سلام اب نہیں ہوں گے، بہت سلام ہوئے

تمھاری باتوں میں تلخی سہی، غرور سہی
یہی بہت ہے کہ تم مُجھ سے ہم کلام ہوئے

بہار ہم کو میسّر نہ ہو سکی اقبالؔ
ہزار بار بہاروں کے اہتمام ہوئے

○

تمھاری یاد مری زندگی ہے، یہ تسلیم
مگر میں چاہوں تو تم کو بُھلا بھی سکتا ہوں

تمھارا غم مرے حق میں چراغِ راہ سہی
میں اس چراغ کو ضد میں بُجھا بھی سکتا ہوں

یہ تیرگی مری دیرینہ دوست ہے ورنہ
میں اپنے گھر کے دِیے پھر جلا بھی سکتا ہوں

میں کیا کروں مجھے ویرانیوں سے عشق سا ہے
خزاں کو ورنہ بہاراں بنا بھی سکتا ہوں

زباں پہ لانے کی ہر بات گو نہیں ہوتی
بضد ہو تم، تو یہ تُہمت اُٹھا بھی سکتا ہوں

سُنے بغیر نہ سمجھے تو سُن کے کیا ہوگا
کہو تو ویسے فسانہ سُنا بھی سکتا ہوں

بایں فسُردہ دلی اپنے دوستوں کے لئے
غزل کے ساز پہ نغمہ سُنا بھی سکتا ہوں

○

جاں نثاروں سے تغافل آپ کا دستور ہے
جانے کیوں یہ بات سارے شہر میں مشہور ہے

کون ہے جو عشق کے انجام سے واقف نہیں
آدمی اپنی طبیعت سے مگر مجبور ہے

یہ تو ہم بھی جانتے ہیں دُور ہے منزل ابھی
بس کوئی اتنا بتا دے اور کتنی دُور ہے

مجھ کو اُن کی برہمی پر کوئی حیرت ہے نہ غم
دوستی میں رنجشیں ہوتی ہیں یہ دستور ہے

تم ذرا اقبالؔ سے مل کر تو دیکھو ایک بار
جانے کس نے کہہ دیا تم سے کہ وہ مغرور ہے

○

اِک وفا دشمن کو بھی اپنا بنا لینا پڑا
یہ فریبِ زندگی، دانستہ کھا لینا پڑا

ہائے مجبوری کہ اوروں کی خوشی کے واسطے
اپنا دامن اُن کے ہاتھوں سے چھڑا لینا پڑا

مُلتجی نظروں سے یوں دیکھا گیا میری طرف
ہر شکایت کو تبسّم میں چھُپا لینا پڑا

اپنی خود داری کے ہاتھوں ہو گئے مجبور ہم
گُل کو کانٹا جان کے، دامن بچا لینا پڑا

بارہا اقبالؔ عزمِ جستجو کے سامنے
حادثاتِ زندگی کو سر جھکا لینا پڑا

دل میں کوئی خلش ہے نہ آنکھوں میں نم ابھی
ہے اپنے اختیار میں احساسِ غم ابھی

ساحل کی بات بعد میں ہوگی ابھی نہیں
طوفانِ زندگی سے مخاطب ہیں ہم ابھی

کچھ لوگ منزلوں سے بھی آگے نکل گئے
کچھ لوگ ڈھونڈھتے ہیں نقوشِ قدم ابھی

تاریخِ غم ہنوز مکمّل نہیں ہوئی
ہوں گے نہ جانے کتنے فسانے رقم ابھی

فی الحال دشمنوں کی ضرورت نہیں ہمیں
کافی ہیں دوستوں کے خصوصی کرم ابھی

مجبور ہو کے ٹوٹ گئے حادثے تمام
ہونے نہ پائی تھیں مری پلکیں بھی نم ابھی

اقبالؔ اب بھی زندہ ہیں کچھ سرفروش لوگ
روشن رہے گا یوں ہی چراغِ حرم ابھی

ہنستا نہیں آتا مجھے، یہ بات نہیں ہے
شاید تمھیں اندازۂ حالات نہیں ہے

یہ کیسے کہوں، اُن سے میں واقف ہی نہیں ہوں
ہاں دُور سے دیکھا ہے، ملاقات نہیں ہے

شکوے تو اُنھیں مجھ سے، ہمیشہ ہی رہیں گے
میرے لئے یہ کوئی نئی بات نہیں ہے

یوں اُن سے ملاقات تو ہو جاتی ہے اکثر
بس سلسلۂ پرسشِ حالات نہیں ہے

ناموسِ محبت کا تحفّظ، ہے بڑی بات
خود اپنا زیاں، کوئی بڑی بات نہیں ہے

بے نُور اُجالوں کو سحر کیسے سمجھ لوں؟
تم لاکھ کہے جاؤ کہ اب رات نہیں ہے

اقبالؔ، بُرا کہتے ہو، تم دل شکنی کو
اِس دَور میں یہ بات، کوئی بات نہیں ہے

○

اب مجھ سے مخاطب نگہِ کم بھی نہیں ہے
یوں ہی سہی، اب دل کا وہ عالم بھی نہیں ہے

مافات کا ماتم بھی ہے، حالات کا غم بھی
لیکن بخدا آنکھ ابھی نم بھی نہیں ہے

تم بھول گئے مجھ کو، یہ اچھا کیا تم نے
اِس ترکِ تعلّق کا مجھے غم بھی نہیں ہے

جو اب ہیں وہ حالات گوارا تو نہیں ہیں
گزرے ہوئے لمحوں کا مگر غم بھی نہیں ہے

یہ بات الگ ہے کہ ہنسی اب نہیں آتی
لیکن مجھے اب فرصتِ ماتم بھی نہیں ہے

○

وہ روٹھ جائیں گے اس طرح بے سبب مجھ سے
مجھے خبر نہ تھی احساسِ زندگی کی قسم

میں اپنے غم سے بھی ہوں مطمئن خدا شاہد
جو مجھ سے روٹھ چکی ہے اسی خوشی کی قسم

جو تیری یاد میں ٹپکا وہ اشک حاصلِ غم
جو اب نہ آئے گی ہونٹوں پہ اس ہنسی کی قسم

تری تلاش میں گُم ہو کے پا گیا سب کچھ
جو مجھ کو راس نہ آئی اُس آگہی کی قسم

مری نگاہ کو اب بھی ہے تابِ نظّارہ
نقاب اُٹھا تجھے دل کی شکستگی کی قسم

فریب دیدہ و دانستہ کھا رہا ہوں میں
تری نگاہ کی معصوم سادگی کی قسم

یہ تو نے کیوں مجھے بیٹھے بٹھائے چھیڑ دیا
میں اپنے حال میں خوش تھا تری خوشی کی قسم

○

مشفق ملے، شفیق ملے، مہرباں ملے
دل جس کو ڈھونڈھتا ہے وہ دیکھیں کہاں ملے

تنہائی ہر قدم پہ مری ہم سفر رہی
مِلنے کو راستے میں کئی کارواں ملے

اُن سے بیانِ حال کی جرأت نہ ہو سکی
کچھ ایسی بے رُخی سے ملے وہ جہاں ملے

جورِ فلک کی ہم کو ضرورت نہیں پڑی
ہم کو اسی زمین پہ سو آسماں ملے

پندارِ شوق ان سے مخاطب نہیں ہوا
رستے میں ہر قدم پہ کئی آستاں ملے

O

تلخیٔ زیست کو ہنس ہنس کے بھلا رکھّا ہے
ہم نے ہر زخم کو سینے سے لگا رکھّا ہے

غم کے احساس پہ ڈالی ہے تبسّم کی نقاب
تا بمقدور ترا راز چھپا رکھّا ہے

نہ مجھے غم سے شکایت، نہ وجہِ غم سے
مجھ کو غم خواروں نے دیوانہ بنا رکھّا ہے

ایک موہوم سی امّید ہے توجیہِ حیات
اک دِیا زد پہ ہواؤں کی جلا رکھّا ہے

عرضِ احوال بھی ہے پُرسشِ احوال بھی ہے
غم کو غم والوں نے افسانہ بنا رکھّا ہے

○

خفا خفا سا ہے احساسِ زندگی اے دوست
ترے بدلتے ہی دُنیا بدل گئی اے دوست

لُٹی لُٹی سی بہاریں، گُھٹا گُھٹا سا چمن
نہ جانے کیوں ہے فسردہ کلی کلی اے دوست

اس انجمن میں کہ آباد تھی ترے دم سے
بُجھی بُجھی ہے چراغوں کی روشنی اے دوست

جہاں چُھٹا تھا مرے ہاتھ سے ترا دامن
بھٹک رہی ہے وہیں اب بھی زندگی اے دوست

ہنسی کی اوٹ میں آنسو چُھپا رہا ہوں میں
سمجھ سکے تو سمجھ میری بے بسی اے دوست

تری خوشی سے عبارت تھی جب خوشی میری
ابھی ہے یاد وہ دورِ سُپردگی اے دوست

اگرچہ ختم ہوئی داستانِ پارینہ
تُو ہی ہے آج بھی عنوانِ زندگی اے دوست

باغ و بہار بن کر وہ انجمن میں آئے
اب جس میں حوصلہ ہو اُن سے نظر ملائے

کانٹوں سے بچ کے شاید کوئی گزر بھی جائے
پھولوں سے اپنا دامن کیسے کوئی بچائے

ملتے ہی آنکھ، آنسو پلکوں پہ جِھلملائے
اظہارِ غم کی جرأت کوئی کہاں سے لائے

اُمید کر رہی ہے پھر راہ میں چراغاں
پھر جستجوئے منزل دھوکے میں آ نہ جائے

جو راز ماحصل ہے پندارِ آرزو کا
وہ راز ڈر رہا ہوں پلکوں تک آ نہ جائے

آنکھیں بھی مُنتظر ہیں سجدے بھی مُنتظر ہیں
بیٹھے ہیں دیر سے ہم یہ انجمن سجائے

ہنسنے کو جی نہ چاہے ہنسنا مگر ضروری
ہم ایسی زندگی سے اقبالؔ باز آئے

○

زندگی، کہنے کو، فردوسِ نظر گزری ہے
دل سے پوچھے کوئی، جس طرح مگر گزری ہے

میں گھرا بیٹھا ہوں ماحول کی تاریکی میں
گو اِسی راہ سے سو بار سحر گزری ہے

یوں بھی گزری ہے غریب الوطنی میں اکثر
رات تو رات ہے، مشکل سے سحر گزری ہے

رونقِ زیست بھی گزری ہے انھیں راہوں سے
دُور ہی دُور سے گزری ہے، مگر گزری ہے

چاند، تاروں کو بھی رشک آیا ہے قسمت پہ مری
یوں بھی اک رات، کبھی تا بہ سحر گزری ہے

فریبِ خندۂ پیہم کسی کو کیا معلوم
بپا ہے دل میں جو ماتم کسی کو کیا معلوم

میں ہنس رہا ہوں بظاہر مگر مرے دل پر
گزر رہا ہے جو عالم کسی کو کیا معلوم

بیانِ حال بصد احتیاط ہے منظور
رموزِ گریۂ کم کم کسی کو کیا معلوم

لبوں تک آکے چھلک جائیں جس سے پیمانے
اُس اک نگاہ کا عالم کسی کو کیا معلوم

یہ حُسنِ سادہ و معصوم ہے نظر کا فریب
مزاجِ گیسوئے برہم کسی کو کیا معلوم

چمن کے لوگ فدا ہیں تبسّمِ گُل پر
پیامِ گریۂ شبنم کسی کو کیا معلوم

اسی پہ دامنِ رحمت کو ناز ہے اقبالؔ
مقامِ دیدۂ پُرنم کسی کو کیا معلوم

○

گلشن سے دُور دُور بہاروں سے دُور دُور
جینا پڑا تمام سہاروں سے دُور دُور

یوں بڑھ رہی ہے کشتیِ عُمرِ رواں مری
موجوں کے ساتھ ساتھ کناروں سے دُور دُور

اکثر رہِ حیات سے گزری ہیں رونقیں
لیکن غمِ حیات کے ماروں سے دُور دُور

کس عافیت سے وقت گزرتا ہے اِن دنوں
اِن ظلمتوں میں، چاند ستاروں سے دُور دُور

گزرا ہوں میں چمن سے بھی اقبالؔ بارہا
لیکن خطا معاف، بہاروں سے دُور دُور

○

یہ نم فضا، یہ گھٹائیں، یہ شام اے ساقی
بہ شرطِ ہوش پھر اک دورِ جام اے ساقی

میں لاکھ تشنہ لب و تشنہ کام اے ساقی
سوال پھر بھی ہے مجھ پر حرام اے ساقی

پھر ایک جلوہ بصد اہتمام اے ساقی
نظر بہ پردہ ہے عالم تمام اے ساقی

جو التفات کی اِک شکل ہے تغافل بھی
تو التفات کو میرا سلام اے ساقی

یہ جامِ مے، یہ تبسّم، یہ چشمِ کیف آگیں
فریب، اور بہ ایں اہتمام اے ساقی

بہ ایں تغافلِ پیہم مری طلب کے لئے
تری نظر میں ہے اب بھی پیام اے ساقی

ترے وقار کی ضامن عقیدتِ اقبالؔ
مرے وقار کا بھی احترام اے ساقی

○

یہ نگاہِ حُسن جُھکی جُھکی، یہ جبینِ ناز دھواں دھواں
مرے بس کی اب نہیں داستاں، مرا کانپتا ہے رُواں رُواں

ہو طلسمِ عالمِ رنگ و بُو، کہ حریمِ انجم و کہکشاں
مرا ساتھ دے گی نظر مری، وہ چُھپیں گے جا کے جہاں جہاں

مرے دل پہ نقش ہیں آج تک وہ یہ احتیاط نوازشیں
وہ غرور و ضبط عیاں عیاں، وہ خلوص و ربط نہاں نہاں

نہ سفر بہ شرطِ مآل ہے، نہ طلب بہ قیدِ سوال ہے
فقط ایک سیریِٔ ذوق کو، میں بھٹک رہا ہوں کہاں کہاں

مری خلوتوں کی یہ جنّتیں کئی بار سج کے اُجڑ چکیں
مجھے بارہا یہ ہوا گماں کہ تم آ رہے ہو کشاں کشاں

ہیں ہنوز یاد وہ قُربتیں، وہ نیاز و ناز، وہ صحبتیں
وہ طلوعِ صبحِ خُنک خُنک، وہ فضائے شامِ جواں جواں

یہ تخیّلات کی زندگی، یہ تصوّرات کی بت دگی
فقط اک فریب خیال پر مری زندگی ہے رواں دواں

○

دل کی دھڑکن کوئی در پردہ اشارہ تو نہیں
راز دارانہ کہیں اُس نے پُکارا تو نہیں

یہ جو پلکوں سے ابھی ٹوٹ کے دامن پہ گرا
میری ڈوبی ہوئی قسمت کا ستارا تو نہیں

آرزو تیری مجھے جو بھی دکھادے، منظور
ورنہ اب زیست کا احسان گوارا تو نہیں

مجھ کو دشوارئِ منزل سے ڈرانے والو!
حاصلِ شوق تلاطم ہے، کنارا تو نہیں

زندگی وقفِ غمِ دوست تو کردوں اقبالؔ
زندگی کا بھی مگر کوئی سہارا تو نہیں

○

لطف و نشاطِ خندۂ پیہم کچھ اور ہے
کیف و سرورِ گریۂ کم کم کچھ اور ہے

گُلشن حسین، اس کی بہاریں حسین تر
لیکن تری نگاہ کا عالم کچھ اور ہے

دل رو رہا ہے اور تبسُّم لبوں پہ ہے
اس بزم میں سلیقۂ ماتم کچھ اور ہے

گزرے جو تیرے ساتھ وہ لمحے بھی یاد ہیں
لیکن ترے فراق کا عالم کچھ اور ہے

ہر غنچۂ چمن کا تبسُّم حیاتِ نو
لیکن پیامِ گریۂ شبنم کچھ اور ہے

جلتے ہوئے چراغ کا عالم کچھ اور تھا
بجھتے ہوئے چراغ کا عالم کچھ اور ہے

اقبالؔ اور آئے گا جینے میں اب مزہ
نظمِ حیات درہم و برہم کچھ اور ہے

○

ہمیں پہ کیوں ہیں عتابات کوئی کیا جانے
تری نظر کے کنایات کوئی کیا جانے

نگاہِ وقت ہے خود اپنی نیند سے بوجھل
کسی کی کیسے کٹی رات کوئی کیا جانے

جو بامراد ہیں وہ خوش نصیب ہیں، لیکن
شکستِ دل کے مقامات کوئی کیا جانے

یہ روٹھ جائے تو کھل جائے رازِ میخانہ
مقامِ رندِ خرابات کوئی کیا جانے

جھکی رہی جو سرِ بزم رات دانستہ
اس اک نظر کے پیامات کوئی کیا جانے

نگاہِ لطف بھی دل پر گراں گزرتی ہے
ستم ظریفیٔ حالات کوئی کیا جانے

نظر کا کام ہے اقبالؔ انتظار، مگر
اُٹھیں گے کب یہ حجابات کوئی کیا جانے

تم نغمۂ ماہ و انجم ہو، تم سوزِ تمنّا کیا جانو
تم دردِ محبّت کیا سمجھو، تم دل کا تڑپنا کیا جانو

کب درد بڑھا کب ہوک اُٹھی، کیوں اشک بہا، کیوں آہ کھنچی
تم گُم ہو بہاروں میں اپنی، تم غم کا فسانہ کیا جانو

اک موجِ تبسّم ہونٹوں پر، اک نغمۂ رنگیں آنکھوں میں
تم رقصِ ثریّا کیا سمجھو، تم بربطِ زہرا کیا جانو

تم رُوٹھ گئے جب جب ہم سے، ہم تم کو منا ہی لیتے تھے
اک بار اگر ہم رُوٹھ گئے، تم ہم کو منانا کیا جانو

تخریبِ محبّت آساں ہے، تعمیرِ محبّت مشکل ہے
تم آگ لگانا سیکھ گئے، تم آگ بُجھانا کیا جانو

تم دُور کھڑے دیکھا ہی کیے اور ڈوبنے والا ڈوب گیا
ساحل ہی کو تم منزل سمجھے، تم لذّتِ دریا کیا جانو

تم حُسنِ سراپا اپنی جگہ، اور حُسنِ سراپا خودداری
اقبالؔ کا غم تم کیوں سمجھو، اور اُس کا دلاسا کیا جانو

○

ملنے میں احتیاط بھی، آنکھوں میں کچھ پیام بھی
ضبط کا التزام بھی، ربط کا اہتمام بھی

لاکھوں چراغ جل گئے ساری فضا میں دُور تک
بھُولے سے آگیا ہے جب ہونٹوں پہ تیرا نام بھی

جرمِ وفا کے مرتکب، چشمِ کرم کے منتظر
آج شریکِ بزم ہیں آپ کے کچھ غلام بھی

آج مزاجِ زندگی نام ہے، اِک تضاد کا
خندہ لبی کا حکم بھی، خندہ لبی حرام بھی

ساری نزاکتوں کا حل ایک تصوّرِ حسیں
آپ سے دُور دُور بھی، آپ سے ہم کلام بھی

○

اِدھر احتیاطِ پیہم، اُدھر اجتنابِ محکم
نہ میں کہہ سکا کہانی، نہ وہ سُن سکے کہانی

مجھے آپ سے گِلہ ہے تو فقط یہی گِلہ ہے
مری بات اپنی ضِد میں کبھی آپ نے نہ مانی

ابھی ابتدا ہی کی ہے ابھی آپ نے سُنا کیا
جو ابھی سے نم ہیں پلکیں تو میں کہہ چکا کہانی

غمِ زندگی سے مجھ کو کوئی خوف اب نہیں ہے
ترے غم سے ہو رہی ہے مرے دل کی پاسبانی

مجھے علم ہے بخوبی کہ تمھارے دل میں کیا ہے
مجھے تم نہ دے سکو گے یہ فریبِ بدگمانی

پیمانے چھلک ہی جاتے ہیں جب کیف کا عالم ہوتا ہے
یہ راز زمانہ کیا جانے، کیوں گریۂ کم کم ہوتا ہے

اب سعیِ تلافی لاحاصل، اب کوششِ درماں بے معنی
جو درد مُقدّر بن جائے، وہ درد کہاں کم ہوتا ہے

اُس وعدہ شکن کے بھولے پن پر کوئی خفا بھی کیسے ہو
اقرار بھی مبہم ہوتا ہے، انکار بھی مبہم ہوتا ہے

انجامِ بہاراں کے ڈر سے پھولوں کو پسینے آتے ہیں
وہ خونِ جگر ہے گلشن کا جو قطرۂ شبنم ہوتا ہے

سچ مُچ کی خوشی مِلتی ہے کسے اِس آہ و بُکا کی دُنیا میں
ہم جس کو تبسّم کہتے ہیں سوچو تو وہ ماتم ہوتا ہے

○

یہ نرم و خُنک شام، یہ شاداب نظارے
گزرے ہوئے لمحات کے مانوس اشارے

پلکوں پہ نمودار ہوئے چند ستارے
جیسے کسی مجبور کے کمزور سہارے

طوفان کناروں سے ابھی دُور ہے، لیکن
طوفان سے محفوظ نہیں ہیں یہ کنارے

یہ رنگ، یہ رونق، یہ پھبن سحرِ نظر ہے
ہر پھول کے سینے میں فروزاں ہیں شرارے

تقدیر سے اُٹھ جاتے ہیں جب دل کے اُجالے
کام آتے ہیں ایسے میں چراغاں نہ ستارے

دامن غمِ ماضی سے کوئی کیسے بچائے
ہر نقش اُبھر آتا ہے یادوں کے سہارے

اقبال یہ آنسو نہ تلافی نہ مداوا
تقدیر کو روتے رہیں تقدیر کے مارے

○

کیا جانے انھیں ہم کیا سمجھے، جو اُن پہ بھروسا کر بیٹھے
امّید کے جھوٹے وعدے پر دل نذرِ تمنّا کر بیٹھے

سب کھو کے بھی ہم کچھ پا نہ سکے، وہ ہم سے الگ ہم اُن سے الگ
دُنیا جسے دیکھے اور ہنسے، ہم ایسا تماشا کر بیٹھے

وہ درد نہیں، وہ ہُوک نہیں، وہ اشک نہیں، وہ آہ نہیں
گُل کر کے چراغوں کو اپنے ہم گھر میں اندھیرا کر بیٹھے

ہم شوق کے ہاتھوں بےبس ہیں، انجامِ سفر تو ظاہر ہے
اب جان پہ بنتی ہے تو بنے، منزل کا ارادہ کر بیٹھے

اک برق سی جیسے کوند گئی، چٹکی جو کلی گلشن میں کہیں
جب اتنی بھی دل میں تاب نہیں، کیوں ضبط کا دعویٰ کر بیٹھے

انجام کی لذّت یاد رہی، آغاز کی شدّت بھول گئے
ساحل کے چھلاوے میں آکر موجوں پہ بھروسا کر بیٹھے

جس آس سے دھڑکن تھی دل میں، جس آس سے نبضیں چلتی تھیں
وہ آس بھی قسمت چھین چکی، ہم یہ بھی گوارا کر بیٹھے

○

جستہ جستہ ان کو اقرارِ وفا ہونے لگا
تحفۂ غم اب تو بے مانگے عطا ہونے لگا

اب جبینِ شوق حائل ہے نہ سنگِ آستاں
آنکھوں ہی آنکھوں میں اب سجدہ ادا ہونے لگا

ایک میخانہ بچا تھا عاصیوں کے واسطے
سو وہاں بھی دخلِ زُہد و اِتّقا ہونے لگا

شکوہ اور میری زباں سے، وہ بھی کس کا، آپ کا؟
آپ کو اب جاں نثاروں سے گِلہ ہونے لگا!

دل کے بھولے پن پہ خود مجھ کو بھی آتی ہے ہنسی
اک ذرا آہٹ ہوئی، سجدہ ادا ہونے لگا

○

لرز رہا ہوں میں احساسِ قُربِ منزل سے
سفینے ڈوب بھی جاتے ہیں مِل کے ساحل سے

میں آہ کر کے نتائج پہ غور کرتا ہوں
نکل نہ آئے کوئی بے نقاب محمل سے

پھر اُس کے بعد جہاں میں کہیں اماں نہ ملی
ہم اُٹھ تو آئے خفا ہو کے تیری محفل سے

عذابِ موج و تلاطم مجھے قبول، مگر
خدا بچائے عذابِ فریبِ ساحل سے

کچھ اور بڑھ گئی دل کی فُسردگی اقبالؔ
کیا کسی نے تبسم نہ جانے کِس دل سے

بفکرِ زیست ذوقِ بندگی کیا
محبّت میں سوالِ زندگی کیا

کبھی ہنس بھی دیے تو بے ارادہ
ہم آشفتہ مزاجوں کی ہنسی کیا

مرا ذوقِ نظر ہے کار فرما
تری محفل کی ورنہ روشنی کیا

قفس کی زندگی تو خیر معلوم
چمن کی زندگی بھی زندگی کیا

جو اپنے تھے وہی جب چھوڑ بیٹھے
کسی سے شکوۂ بیگانگی کیا

قفس کو کوئی پھولوں سے سجائے بھی تو کیا ہوگا
حقیقت کوئی پردوں میں چھپائے بھی تو کیا ہوگا

ہمارے غمکدے تک روشنی پہنچے تو ہم جانیں
ستارے آسماں پر جگمگائے بھی تو کیا ہوگا

نہ جانے کب سے سچ مچ کی ہنسی کو جی ترستا ہے
جو دل پر جبر کر کے مسکرائے بھی تو کیا ہوگا

چمن والوں نے کوئی تار دامن میں نہیں چھوڑا
کوئی کانٹوں سے اب دامن بچائے بھی تو کیا ہوگا

جہاں ہر بات ٹالی جائے بامعنی تبسم سے
وہاں رودادِ غم کوئی سنائے بھی تو کیا ہوگا

میں شگفتہ لبِ اظہار کہاں سے لاؤں
عشق و رومان کے اذکار کہاں سے لاؤں

قصۂ تلخئ دوراں میں سنا سکتا ہوں
داستانِ لب و رخسار کہاں سے لاؤں

اپنے احساس سے میں جھوٹ کہاں تک بولوں
شعر میں شوخئ افکار کہاں سے لاؤں

میں غزل گو ہوں قصیدہ تو نہیں کہہ سکتا
کیا کروں لہجۂ دربار کہاں سے لاؤں

آپ کے شہر میں رونق تو بہت ہے لیکن
اپنے گھر کے در و دیوار کہاں سے لاؤں

صوت و الفاظ کی ضربت پہ بھروسہ ہے مجھے
میں تہی دست ہوں تلوار کہاں سے لاؤں

میں تو بِک سکتا ہوں صرف ایک تبسّم کے عوض
لیکن اب ایسے خریدار کہاں سے لاؤں

غم زدہ لوگ تو مِل سکتے ہیں جتنے چاہو
آج کے دَور میں غم خوار کہاں سے لاؤں

مجھ کو معلوم ہے میں جنسِ گراں ہوں اقبالؔ
لیکن اب مصر کا بازار کہاں سے لاؤں

○

ضبط بھی چاہیئے، ظرف بھی چاہیئے اور محتاط پاسِ وفا چاہیئے
زندگی دشمنوں میں بھی مشکل نہیں، آدمی میں ذرا حوصلہ چاہیئے

ہم کو منزل شناسی پہ بھی ناز ہے اور ہم آشنائے حوادث بھی ہیں
جوئے خوں سے گزرنا پڑے بھی تو کیا، جستجو کو تو اک راستہ چاہیئے

اپنے ماتھے پہ بل ڈال کر تم ہمیں شیش محلوں کے اندر سے جھڑکی نہ دو
ہم بھکاری نہیں ہیں کہ ٹل جائیں گے، ہم کو اپنی وفا کا صلہ چاہیئے

تم نے آرائشِ گلستاں کے لئے، ہم سے کچھ خون مانگا تھا مدت ہوئی
تم سے خیرات تو ہم نہیں مانگتے، ہم کو اس خون کا خوں بہا چاہیئے

میری مانو تو اک بات تم سے کہوں، یہ نیا دَور ہے اس کا کیا ٹھیک ہے
دوستوں سے مِلو محفلوں میں مگر، آستینوں کا بھی جائزہ چاہیئے

حد سے بڑھ کر محبّت مناسب نہیں، اس میں اندیشۂ بدگمانی بھی ہے
دشمنوں سے تعلّق تو ہے ہی غلط، دوستوں میں بھی کچھ فاصلہ چاہیے

ہم کو ہر موڑ پر دوست ملتے رہے، ہم کبھی راہِ منزل میں تنہا نہ تھے
کل غمِ دوست تھا، اب غمِ زیست ہے، آشنا کو تو اک آشنا چاہیے

قفلِ زنداں اگر تم نہیں کھولتے، کم سے کم لب کشائی کی مہلت تو دو
ہم نواگر ہیں کوئی گداگر نہیں، ہم اسیروں کو اذنِ نوا چاہیے

جُرمِ بے باک گوئی کی پاداش میں زہر اقبالؔ کو زندگی نے دیا
اُس نے اُس زہر کو بھی سخن کر لیا، اِس زمانے کو اب اور کیا چاہیے

○

خطا معاف، یہ کچھ اور ہے حیا تو نہیں
کہیں یہ ترکِ تعلق کی ابتدا تو نہیں

یہ بات الگ ہے کہ آنکھوں کے بند ٹوٹ گئے
مگر زباں سے کبھی ہم نے کچھ کہا تو نہیں

خطا تو جب ہو کہ ہم عرضِ مدعا بھی کریں
کسی کو چاہتے رہنا کوئی خطا تو نہیں

جو بات دل میں ہے بے خوف کیوں نہیں کہتے
زبان و قلب میں کچھ ایسا فاصلہ تو نہیں

نصیب کیسے بدل دے کوئی سفینے کا
جو ناخدا ہے وہ سب کچھ سہی خدا تو نہیں

میں ان کی بات کا کوئی اثر نہیں لیتا
مرے عدو کہیں اس بات پر خفا تو نہیں

ابھی سے اس کے نتائج کا تجزیہ نہ کرو
یہ ابتدا ہے مسافت کی، انتہا تو نہیں

نہ جانے قافلے والے خفا ہیں کیوں مجھ سے
میں صرف ایک مسافر ہوں، رہنما تو نہیں

حضور! آپ نے اقبال کو غلط سمجھا
وہ پارسا ہے مگر آدمی برا تو نہیں

○

شہر کا شہر جب دہائی دے
کوئی فریاد کیا سُنائی دے

کوئی کیسے کسی کو پہچانے
روشنی ہو تو کچھ دکھائی دے

کم سے کم اتنی روشنی یا رب!
ہاتھ کو ہاتھ تو سُجھائی دے

مجھ کو کرنا ہے زندگی سے نباہ
مجھ کو تھوڑی سی بے وفائی دے

بد دعائیں نہ سُن سکوں گا میں
مجھ کو شاہی نہ دے، گدائی دے

لفظ پابندِ مصلحت ہیں ہنوز
ان کو اس قید سے رہائی دے

ضبط اب میرے بس کی بات نہیں
مجھ کو بھی اِذن لب کشائی دے

لے سکوں دشمنوں سے درسِ خلوص
مجھ کو وہ ظرف آشنائی دے

جن کے دل کھو چکے ہوں بینائی
ان کو آنکھوں سے کیا دکھائی دے

عاجزی میری خو، نہ بن جائے
مجھ کو توفیقِ خود نمائی دے

○

نئے خداؤں سے مشروط دوستی کرلی
فقیہِ شہر نے تجدیدِ بندگی کرلی

وہ بدنصیب جسے سب ضمیر کہتے تھے
سُنا ہے اس نے کہیں چُھپ کے خودکشی کرلی

اسے خلوص کہو یا ہماری نادانی
جو کوئی ہنس کے مِلا اس سے دوستی کرلی

مَبادا کوئی فرشتہ ہمیں سمجھ بیٹھے
خطا بھی جان کے ہم نے کبھی کبھی کرلی

چراغ سب نے جلائے تو ان کی خاطر سے
ذرا سی دیر کو ہم نے بھی روشنی کرلی

بہارِ صحنِ چمن تک نہ جانے کب پہنچے
خزاں سے ہم نے سرِ دست دوستی کر لی

کوئی بتائے کہ منزل کا کیا قصور اقبالؔ
ہمیں نے راہ میں دیوار خود کھڑی کر لی

○

ہونٹوں پہ تمھارے جو کوئی مُہر لگا دے
تعریف تو جب ہے کہ خموشی بھی صدا دے

اس دَور میں جینے کا اُسے حق بھی نہیں ہے
جو شخص تہِ تیغ بھی قاتل کو دعا دے

کچھ ایسے طرحدار بھی زندہ ہیں ابھی تک
مقتل بھی جنھیں کوچۂ جاناں کا مزہ دے

دیوارِ سرِ راہ کے شاکی تو سبھی ہیں
کوئی نہیں جو بڑھ کے یہ دیوار گرا دے

جس گھر کو مُیسّر نہ ہو مٹّی کا دیا بھی
اُس گھر کو تو بہتر ہے کوئی آگ لگا دے

ہم ماتھے پہ بل ڈال کے بازار سے گزرے
ہم جیسے فقیروں کو کوئی دے بھی تو کیا دے

وہ لوگ جنھیں پاسِ شریعت بھی نہیں ہے
پہنے ہوئے بیٹھے ہیں مشیخت کے لبادے

رہزن ہو کہ رہبر کوئی اب ان سے نہ اُلجھے
کچھ اور ہیں اب قافلے والوں کے ارادے

اقبالؔ میں ہر حال میں راضی بہ رضا ہوں
سب اُس کی عطا ہے وہ جزا دے کہ سزا دے

○

لاکھ میں سب سے خفا ہو کے چلا تھا گھر سے
میرا رشتہ کسی منزل پہ نہ ٹوٹا گھر سے

پوری رُوداد سفر تو ہمیں اب یاد نہیں
وہ گھڑی یاد ہے جب کُوچ کیا تھا گھر سے

لُوٹنے والوں نے ہر فکر سے آزاد کیا
گھر کھُلا چھوڑ کے ہم چل دئے تنہا گھر سے

ہم نے ہر طاق میں اک شمع جلا کر دیکھی
پھر بھی رخصت نہ ہوا گھر کا اندھیرا گھر سے

غم کی توہین تھی ساقی کا سہارا لینا
ورنہ میخانہ بہت دُور نہیں تھا گھر سے

اِس طرح ایک نیا شہر ہوا ہے آباد
ربطِ ہمسائیگی باقی نہیں گھر کا گھر سے

(ق)

پاس کے گھر میں کوئی رات بہت روتا تھا
ہم نے آواز بھی دی کوئی نہ نکلا گھر سے

اب تو جیسے بھی ہو اقبال گزارا کر لو
کوئی کیا آئے گا جب خط بھی نہ آیا گھر سے

○

یہ مری انا کی شکست ہے، نہ دوا کرو نہ دعا کرو
جو کرو تو بس یہ کرم کرو مجھے میرے حال پہ چھوڑ دو

وہ جو ایک ترکشِ وقت ہے ابھی اُس میں تیر بہت سے ہیں
کوئی تیر تم کو نہ آ لگے مرے زخمِ دل پہ نہ یوں ہنسو

نہ میں کوہکن ہوں، نہ قیس ہوں، مجھے اپنی جان عزیز ہے
مجھے ترکِ عشق قبول ہے، جو تمھیں یقینِ وفا نہ ہو

جو تمھارے دل میں شکوک ہیں تو یہ عہد نامے فضول ہیں
جو مرے خطوط ہیں پھاڑ دو، یہ تمھارے خط ہیں سمیٹ لو

جو کسی کو کوئی ستائے گا تو گلہ بھی ہونٹوں تک آئے گا
یہ تو اک اصول کی بات ہے، جو خفا ہے مجھ سے کوئی تو ہو

مجھے اب صداؤں سے کام ہے، مجھے خال و خد کی خبر نہیں
تو پھر اس فریب سے فائدہ یہ نقاب اب تو اُتار دو

مجھے اپنے فقر پہ ناز ہے، مجھے اس کرم کی طلب نہیں
میں گدا نہیں ہوں فقیر ہوں، یہ کرم گداؤں میں بانٹ دو

یہ فقط تمھارے سوال کا مرا مختصر سا جواب ہے
یہ گلہ نہیں ہے، خلوص ہے، مری گفتگو کا اثر نہ لو

یہ ادھورے چاند کی چاندنی بھی اندھیری رات میں کم نہیں
کہیں یہ بھی ساتھ نہ چھوڑ دے، ابھی روشنی ہے چلے چلو

○

ہمیں جن دوستوں نے بے گناہی کی سزا دی ہے
ہمارا ظرف دیکھو ہم نے ان کو بھی دعا دی ہے

مبادا مُہرِ خاموشی لگا دی جائے ہونٹوں پر
غزل کو احتیاطاً ہم نے گویائی سکھا دی ہے

رضا کارانِ آزادی کے شوقِ تاجپوشی نے
جو کچھ رتبہ بڑھایا ہے تو قیمت بھی گھٹا دی ہے

بنامِ دینِ ابراہیمؑ بس اتنا کیا ہم نے
کہ بُت خانے سے مِلتی جُلتی اک مسجد بنا لی ہے

یہ سچ ہے بجلیاں بھی بارہا ٹوٹی ہیں گلشن پر
مگر اس آگ کے شعلوں کو خود ہم نے ہوا دی ہے

○

سُنا تھا جشن ہوگا اور گھر گھر روشنی ہوگی
نہیں معلوم یہ تقریب کب تک ملتوی ہوگی

یہ بے مقصد سفر اب ختم ہو جاتا تو اچھا تھا
نہ تم سے رہبری ہوگی، نہ ہم سے پیروی ہوگی

دلوں کو نور بخشو تا کہ گھر گھر روشنی پھیلے
چراغوں سے اگر ہو بھی تو کتنی روشنی ہوگی

طلوعِ صبحِ صادق کی چمک کچھ اور ہوتی ہے
تمھیں دھوکا ہوا، شاید کہیں بجلی گری ہوگی

مرے جُرمِ وفا کا فیصلہ کچھ اس طرح ہوگا
سزا کا حکم فوری اور سماعت سرسری ہوگی

بجھالو اپنی آنکھیں جس طرح ہم نے بجھالی ہیں
نہ خوفِ تیرگی ہوگا نہ فکرِ روشنی ہوگی

ہمارے شہر کا احوال سُنئے گا تو ہنسئے گا
کتابوں میں کبھی ایسی کہانی کیا پڑھی ہوگی

یہاں سے جب کوئی سیّاح اپنے گھر گیا ہوگا
ہماری بات اس نے جانے کس کس سے کہی ہوگی

ہمیں دربارِ شاہی میں نہ لے چلتے تو اچھا تھا
ہمارا کچھ نہ جائے گا تمھیں شرمندگی ہوگی

تقاضا وقت کا اقبالؔ کیا ہے میں سمجھتا ہوں
میں اپنے ہونٹ سی تو لوں مگر یہ خودکشی ہوگی

○

وہ یُوں مِلا کہ بظاہر خفا خفا سا لگا
وہ دوسروں سے مگر مجھ کو کچھ جُدا سا لگا

مزاج اس نے نہ پوُچھا مگر سلام لیا
یہ بے رُخی کا سلیقہ بھی کچھ بھلا سا لگا

وہ جس کی کم سُخنی کو غرور سمجھا گیا
مری نگاہ کو وہ پیکرِ حیا سا لگا

میں اپنے کرب کی رُوداد اس سے کیا کہتا
خود اس کا دل بھی مجھے کچھ دُکھا دُکھا سا لگا

غُبارِ وقت نے کچھ یُوں بدل دئے چہرے
خود اپنا شہر بھی مجھ کو نیا نیا سا لگا

گھٹی گھٹی سی لگی رات انجمن کی فضا
چراغ جو بھی جلا کچھ بُجھا بُجھا سا لگا

جو ہم پہ گزری ہے شاید سبھی پہ گزری ہے
فسانہ جو بھی سنا کچھ سُنا سُنا سا لگا

میں گھر سے چل کے اکیلا یہاں تک آیا ہوں
جو ہم سفر بھی ملا کچھ تھکا تھکا سا لگا

کچھ اس خلوص سے اس نے کہا مجھے اقبالؔ
خود اپنا نام بھی مجھ کو بہت بڑا سا لگا

مجھے اپنے ضبط پہ ناز تھا سرِ بزم رات یہ کیا ہوا
مری آنکھ کیسے چھلک گئی، مجھے رنج ہے یہ بُرا ہوا

مری زندگی کے چراغ کا یہ مزاج کوئی نیا نہیں
ابھی روشنی، ابھی تیرگی، نہ جلا ہوا نہ بُجھا ہوا

مجھے جو بھی دشمنِ جاں ملا وہی پختہ کارِ جفا ملا
نہ کسی کی ضرب غلط پڑی نہ کسی کا تیر خطا ہوا

مجھے آپ کیوں نہ سمجھ سکے یہ خود اپنے دل ہی سے پوچھئے
مری داستانِ حیات کا تو ورق ورق ہے کُھلا ہوا

جو نظر بچا کے گزر گئے مرے سامنے سے ابھی ابھی
یہ مرے ہی شہر کے لوگ تھے مرے گھر سے گھر ہے ملا ہوا

ہمیں اس کا کوئی بھی حق نہیں کہ شریکِ بزمِ خلوص ہوں
نہ ہمارے پاس نقاب ہے نہ کچھ آستیں میں چھپا ہوا

مرے ایک گوشۂ فکر میں، میری زندگی سے عزیز تر
مرا ایک ایسا بھی دوست ہے جو کبھی ملا نہ جدا ہوا

مجھے اک گلی میں پڑا ہوا، کسی بدنصیب کا خط ملا
کہیں خونِ دل سے لکھا ہوا، کہیں آنسوؤں سے مٹا ہوا

مجھے ہم سفر بھی مِلا کوئی تو شکستہ حال مری طرح
کئی منزلوں کا تھکا ہوا، کہیں راستے میں لُٹا ہوا

ہمیں اپنے گھر سے چلے ہوئے، سرِ راہ عمر گزر گئی
کوئی جستجو کا صلہ ملا، نہ سفر کا حق ہی ادا ہوا

چُپ رہتے تو دم گھٹتا اور درد سوا ہوتا
کچھ مُنھ سے نکل جاتا تو کوئی خفا ہوتا

یہ سوچ کے ہم پھر بھی بیٹھے رہے محفل میں
ہم اُٹھ کے چلے آتے تو اور بُرا ہوتا

ترکش میں جو باقی ہے وہ تیر بھی کیوں رکھّا
جو کچھ بھی ارادہ تھا، پورا تو کیا ہوتا

ہم دل میں جگہ دیتے، سینے سے لگا لیتے
جو تیر تمھارا تھا، وہ کیسے خطا ہوتا

تم ہم پہ جفا کرتے، ہم تم کو دعا دیتے
بے لوث محبّت کا کچھ حق تو ادا ہوتا

آپس کی شکر رنجی کا غیروں سے کیا رشتہ
شکوہ تمھیں کرنا تھا تو ہم سے کیا ہوتا

وہ جب بھی ذرا روٹھا، چُپ بیٹھے رہے ہم بھی
اک بار منا لیتے تو روز خفا ہوتا

اقبالؔ سے کل تم نے جس لہجے میں باتیں کیں
وہ اُٹھ کے چلا جاتا محفل سے تو کیا ہوتا

○

آپ کو ہم جانتے ہیں ہم کو مت بہلائیے
وعدہ کرنا ہے تو کر لیجے قسم مت کھائیے

یہ نہ پوچھیں آپ میرے دل میں کتنے زخم ہیں
اور کتنے تیر ہیں ترکش میں یہ فرمائیے

از رہِ تمہید پُرسش کا تکلّف چھوڑیئے
میرے لائق کوئی خدمت ہو تو وہ فرمائیے

آپ کو اصرار ہے ترکِ تعلّق پر تو خیر
آپ کے کچھ خط ہیں میرے پاس، لیتے جائیے

مُسکراہٹ رو کیے، نظریں جُھکا کر بیٹھیے
آپ کیسے جانِ محفل ہیں، ذرا شرمائیے

عمر بھر کی داستاں یوں ختم ہونے سے رہی
رات گہری ہو چلی، اب پھر سہی، سو جائیے

اپنا دُکھڑا روئیے اقبالؔ کس کے سامنے
کس کو کس کو اپنے ذاتی مسئلے سمجھائیے

○

وہ نظر سے دُور تو ہیں مگر یہ عجیب صورتِ حال ہے
ہمہ وقت پیشِ نظر بھی ہیں، نہ فراق ہے نہ وصال ہے

نہ وہ ہم سے کم، نہ ہم اُن سے کم، وہ اُدھر خفا ہم اِدھر خفا
نہ اُنھیں ہمارا خیال ہے نہ ہمیں دماغِ سوال ہے

یہی قربتیں، یہی فاصلے تو خلوصِ عشق کی جان ہیں
کبھی گردِ رنج و ملال ہے، کبھی فکرِ پرسشِ حال ہے

یہ تمھاری تلخ نوائیاں کوئی اور سہہ کے دکھا تو دے
یہ جو مجھ میں تم میں نباہ ہے مرے حوصلے کا کمال ہے

مجھے اس کا کوئی بھی غم نہیں کہ کسی نے مجھ سے وفا نہ کی
میں کسی کے کام نہ آ سکا مجھے صرف اس کا ملال ہے

جو گزر رہی ہے گزار دو، نہ بُرا کہو، نہ گلہ کرو
جو تمھارا حال ہے دوستو، وہی سارے شہر کا حال ہے

میں کہاں سے لاؤں وہ روشنی جو کسی کے شہر میں لُٹ گئی
وہ کسی کا شہر بھی لُٹ گیا مجھے اس کا اور ملال ہے

ترے مشورے کے خلوص پر مجھے ترکِ عشق قبول ہے
مگر ایک بات ہے ہم نشیں، مری زندگی کا سوال ہے

○

اس نے عرضِ مدعا کی مجھ سے فرمائش تو کی
لفظ ہونٹوں تک نہ پہنچے، میں نے کچھ کوشش تو کی

چارہ سازی کی توقع تو الگ اک بات ہے
یہ بھی کیا کم ہے کہ اس نے زحمتِ پرسش تو کی

میری چشمِ شوق ہی اس کو مخاطب کر سکی
ساری محفل میں نگاہِ ناز نے گردش تو کی

ان کے کہنے میں نہ آیا قلبِ انجام آشنا
ان کی نظروں نے مری نظروں سے کچھ سازش تو کی

یہ بھی سوچا اس چمن کے باغباں ہیں کون لوگ!
آپ نے خونِ جگر سے اس کی آرائش تو کی

حسبِ منشاء میرے شکوے کارگر ثابت ہوئے
کفر تو ٹوٹا، لبوں نے آپ کے جنبش تو کی

وہ تو کہئے سخت جاں تھے ہم حوادث آشنا
گردشِ دوراں نے ورنہ پے بہ پے یورش تو کی

رفتہ رفتہ آ گئے اقبالؔ آدابِ سفر
اوّل اوّل میرے قدموں نے ذرا لغزش تو کی

○

کوچے میں ترے کون سا جادو ہے نہ جانے
جو لَوٹ کے آوے ہے وہ دیوانہ لگے ہے

یاد آویں ہیں جب نیند سے بوجھل تری آنکھیں
غم خانہ بھی جیسے مجھے میخانہ لگے ہے

افسانہ تو سب جانیں ہیں سچا نہیں ہوتا
اس دَور میں سچ بات بھی افسانہ لگے ہے

چہروں کا عجب حال ہے افکار کے ہاتھوں
اپنا بھی مِلے کوئی تو بیگانہ لگے ہے

مسجد جو ابھی حال میں تعمیر ہوئی ہے
کعبہ ہی لگے ہے نہ صنم خانہ لگے ہے

درویش نما لوگوں سے بچ بچ کے گزریو
انداز فقط ان کا فقیرانہ لگے ہے

گلشن بھی بہت دیکھے ہیں ان آنکھوں نے اقبالؔ
جن آنکھوں کو اب شہر بھی ویرانہ لگے ہے

چہروں پہ نہ رونق ہے، نہ ہونٹوں پہ تبسم
اب محفلِ احباب بھی غم خانہ لگے ہے

○

دوستی اُس سے کوئی کیسے بڑھانا چاہے
ہاتھ تو ہاتھ جو آنکھیں نہ ملانا چاہے

حُسنِ معصوم کی پہچان ہے یہ حُسنِ تضاد
خود مخاطب بھی ہو، آنکھیں بھی چُرانا چاہے

زخم تو ایک تبسّم بھی لگا سکتا ہے
سو بہانے ہیں اگر کوئی ستانا چاہے

ہم نے کب زحمتِ پُرسش کی گزارش کی تھی
اُس سے کہئے جو یہ احسان اُٹھانا چاہے

ایسے نادان کو اس دَور میں کیا کہتے ہیں
زخم کھا کھا کے جو آنسو بھی چھپانا چاہے

ہم بھی اب دیں گے جفاؤں سے جفاؤں کا جواب
اب ہمیں کچھ بھی کہے سارا زمانہ چاہے

اس کا اقبالؔ گلستاں میں گزر کیسے ہو
رہ کے کانٹوں میں جو دامن بھی بچانا چاہے

○

چارہ گر کھو گئے، نیند آ گئی غمخواروں کو
اپنی رُوداد سُنائیں کسے؟ دیواروں کو!

ان کو آنا ہی پڑا سوئے حرم کیا کرتے
بتکدے راس نہیں آئے پرستاروں کو

لاکھ ڈالی گئی چہروں پہ تقدّس کی نقاب
لوگ پہچان گئے حاشیہ برداروں کو

آتے آتے ہی انھیں آئیں گے آدابِ قفس
کوئی چھیڑے نہ ابھی تازہ گرفتاروں کو

جَیبِ دانش سے اُلجھ جاتا ہے جب دستِ جنوں
دیکھتا ہے وہ قباؤں کو نہ دستاروں کو

اب مسیحائی کا آسان طریقہ یہ ہے
زہر دے دیتے ہیں سوتے ہوئے بیماروں کو

جو تھے بازار میں اقبالؔ کبھی جنسِ گراں
ڈھونڈھتے پھرتے ہیں وہ لوگ خریداروں کو

○

تمھاری اس نوازش کا میں طالب تھا نہ طالب ہوں
تمھیں دھوکا ہوا شاید کہ میں تم سے مخاطب ہوں

تم آزردہ ہوئے مجھ سے مجھے افسوس ہے لیکن
غلط الزام کیسے مان لوں میں حق بجانب ہوں

مجھے کچھ آپ سے کہنا تو تھا، کچھ کیا، بہت کچھ تھا
مگر میں کیا کروں میں قائل حفظِ مراتب ہوں

شبِ غم پھر شبِ غم ہے اندھیرا اس کی فطرت ہے
شبِ غم سے نہیں، میں شکوہ سنجِ صبحِ کاذب ہوں

نہ رسوائی کا اندیشہ، نہ زحمت لب کشائی کی
جو آنکھیں گفتگو کرتی ہیں مَیں ان سے مخاطب ہوں

جو مِلنا ہے تو مجھ سے دوستوں کی سطح پر ملئے
نہ درباری ہوں میں کوئی نہ حضرت کا مصاحب ہوں

بس اتنا ہے کہ میں اقبالؔ ہوں اور شعر کہتا ہوں
یہ میں نے کب کہا میں حضرتِ اقبالؔ و غالبؔ ہوں

○

میرا کیا حال ہے خود اپنی جفا سے پوچھو
اپنے بھولے ہوئے پیمانِ وفا سے پوچھو

حق بجانب ہے کہاں تک مری شکوہ سنجی
اپنی افسردہ و نم چشمِ حیا سے پوچھو

قافلے کیسے لٹے، کون سی منزل پہ لٹے
مجھ سے مت پوچھو، کسی راہ نما سے پوچھو

مجھ سے مت پوچھو تقدّس کے عناصر کیا ہیں
جُبّہ و طُرّہ و دستار و قبا سے پوچھو

نامرادوں کو کسی بات کی فرصت ہی کہاں
شکر کہتے ہیں کسے دستِ گدا سے پوچھو

سادہ لوحوں کو جفاؤں کا مزہ کیا معلوم
لذّتِ جرمِ وفا اہلِ وفا سے پوچھو

سجدۂ شکر بہر حال کیا ہے میں نے
میرا شاہد ہے خدا، میرے خدا سے پوچھو

میں نے کیوں خود کو اندھیروں میں چھپا رکھا ہے
اس ارادے کا سبب میری انا سے پوچھو

خوش خراموں سے نہ پوچھو کبھی منزل کا پتہ
پوچھنا ہو تو کسی آبلہ پا سے پوچھو

○

نقاب پوشوں کو پہچان لو سرِ محفل
ہم آج ساری نقابیں اُٹھائے دیتے ہیں

یہ لوگ لوٹ بھی سکتے ہیں راستے میں تمھیں
قدم قدم پہ جو آنکھیں بچھائے دیتے ہیں

یہ کون لوگ ہیں جو شوقِ سرفروشی میں
لہُو لہُو ہیں مگر مُسکرائے دیتے ہیں

یہ کیسے لوگ ہیں، عقلوں کو کیا ہوا ان کی؟
جو روشنی کے لئے گھر جلائے دیتے ہیں

سحر کے دھوکے میں کچھ سادہ لوح تیرہ نصیب
چراغ گھر کے ابھی سے بُجھائے دیتے ہیں

یہ کس کے ہاتھ ہیں تم توڑ کیوں نہیں دیتے
جو شہر بھر کی فصیلیں گرائے دیتے ہیں

ہمارے سامنے کل تک جو طفلِ مکتب تھے
خدا کی شان وہ اب ہم کو رائے دیتے ہیں

○

تم ماتھے پہ بل ڈال کے جو بات کرو گے
تو یاد رہے ہم سے بھی ویسی ہی سنو گے

یہ ہم سفری مصلحتِ وقت تھی ورنہ
یہ تو ہمیں معلوم تھا تم ساتھ نہ دو گے

یہ تازہ ستم ہم کو گوارا تو نہیں ہے
ہم یہ بھی سہے لیتے ہیں کیا یاد کرو گے

ہم شوق میں برباد ہوئے اپنے ہی ہاتھوں
روداد ہماری جو سنو گے تو ہنسو گے

تم آج سمجھتے ہو ہمیں غیر تو سمجھو
اوروں سے ملو گے تو ہمیں یاد کرو گے

ہم بھی کوئی دریوزہ گردوں میں سے نہیں ہیں
تم اپنی جگہ ہو گے بڑے لوگ، تو ہو گے

منزل بھی ابھی دوُر ہے اور راہ بھی دشوار
کیا ہو گا اگر اپنے ہی سائے سے ڈرو گے

اپنوں سے خفا ہو کے کہاں جاؤ گے آخر
اقبالؔ کو کب تک نظر انداز کرو گے

○

ہر چند ان کے حکم کی تعمیل کی گئی
جُرمِ وفا کی پھر بھی سزا ہم کو دی گئی

اک شاہراہِ منزلِ مقصود تو بنی
دیوار ہر قدم پہ مگر کھینچ دی گئی

قاضی ہیں دُبلے شہر کے اندیشے میں مگر
ان سے خود اپنے گھر کی حفاظت نہ کی گئی

سو بار انجمن میں چراغاں کیا گیا
چہروں پہ نور آیا نہ تیرہ شبی گئی

کہنے کو گُل ہوا ہے فقط ایک ہی چراغ
سچ پوچھئے تو بزم کی رونق چلی گئی

اک داستان آنکھوں میں میری جو بند ہے
لکھی گئی کہیں نہ زبانی سُنی گئی

اقبال کہنے والا بڑی بات کہہ گیا
" اس عاشقی میں عزّتِ سادات بھی گئی "

○

کیا تھا ذرا سی دیر میں کیا ہو گیا کوئی
دو دن جُدا رہا تو نیا ہو گیا کوئی

وہ بھی مجھے عزیز تھا میں بھی اُسے عزیز
پھر جانے کیا ہوا کہ خفا ہو گیا کوئی

میری نظر نے اس کو خد و خال دے دئے
زہرہ جمالِ شہرِ سبا ہو گیا کوئی

محفل میں تھا تو چاند کی صورت صبیح تھا
تنہا ملا تو رنگِ حنا ہو گیا کوئی

اس خوش ادا گریز کے قربان جائیے
مجھ کو سلام کر کے ہوا ہو گیا کوئی

الزام ہم پہ آیا کہ ہم مستعد نہ تھے
جب بھی کسی کا تیر خطا ہو گیا کوئی

مجھ جیسے بے نوا کو نوازا بصد خلوص
یوں بھی بڑا تھا اور بڑا ہو گیا کوئی

○

شمعِ امّید بہر گام جلائے رکھنا
رات گہری ہے ابھی جوت جگائے رکھنا

قافلہ کوچ نہ کر دے کہیں ہشیار رہو
اپنے کاندھوں پہ ابھی بوجھ اُٹھائے رکھنا

رات باقی ہے ابھی صبح کا کچھ ٹھیک نہیں
کچھ ستارے ابھی پلکوں پہ سجائے رکھنا

ایک آنسو کا سہارا ابھی بہت ہوتا ہے
روشنی کم سہی یہ شمع جلائے رکھنا

تم کو وِرثے میں مِلا ہے یہ محبت کا عَلم
اس کی تعظیم کرو، اس کو اُٹھائے رکھنا

ان پہ تحریر ہے اک عہدِ وفا کی تاریخ
اپنے ہر زخم کو سینے سے لگائے رکھتا

کیا خبر آہوں کی کس وقت ضرورت پڑ جائے
اپنے یہ فیصلہ کُن تیر چھپائے رکھتا

○

مرا خلوص اگر معتبر نہ ہو نہ سہی
نگاہِ نازِ مخاطب اِدھر نہ ہو نہ سہی

گزر ہی جائے گی یہ زندگی خوش و ناخوش
ہمارے حال کی تم کو خبر نہ ہو نہ سہی

یہ دیکھنا ہے کہ کتنی طویل ہے یہ رات
تمام شمعیں جلا دو، سحر نہ ہو نہ سہی

ہمارے جسم کا سایہ تو ساتھ چلتا ہے
رہِ سفر میں کوئی ہم سفر نہ ہو نہ سہی

دعا کرو کہ رہیں اپنی بستیاں آباد
ہمارا کیا ہے کوئی اپنا گھر نہ ہو نہ سہی

یہ اضطراب کا عالم بھی کچھ بُرا تو نہیں
سکون نصیب ہمیں عمر بھر نہ ہو نہ سہی

مرا سلام اشارے ہی سے قبول کرو
کلام مجھ سے مناسب اگر نہ ہو نہ سہی

○

سب سمجھتے ہیں کہ ہم کس کارواں کے لوگ ہیں
پھر بھی پُوچھا جا رہا ہے ہم کہاں کے لوگ ہیں

ملّتِ بیضا نے یہ سیکھا ہے صدہا سال میں
یہ یہاں کے لوگ ہیں اور وہ وہاں کے لوگ ہیں

ان سے مت پُوچھو کہ منزل تم سے کیوں چھینی گئی
ان سے مت اُلجھو، یہ میرِ کارواں کے لوگ ہیں

خالی پیمانے لئے بیٹھے ہیں رندانِ کرام
میکدہ ان کا ہے جو پیرِ مغاں کے لوگ ہیں

گُل فروشی سے انھیں ہم روکنے والے ہیں کون
ہم چمن کے لوگ ہیں وہ باغباں کے لوگ ہیں

سرکشی کی کیا سزا ہے اپنے دل سے پوچھیے
یاد کیجیے، آپ تو باغِ جناں کے لوگ ہیں

اپنے دشمن سے ہمیں اقبالؔ کوئی ڈر نہیں
ان سے بیشک خوف ہے جو درمیاں کے لوگ ہیں

خوش خیالی میں نشیمن نہ سجاؤ پہلے
آبروئے صحنِ گلستاں کی بچاؤ پہلے

بعد میں جشنِ چراغاں کا تکلّف کرنا
گھر میں جو آگ لگی ہے وہ بجھاؤ پہلے

شکریہ پرسشِ احوال کی زحمت کا مگر
اپنے چہروں سے نقابیں تو اٹھاؤ پہلے

ہاتھ کیا، دل بھی ملا سکتے ہیں ہم اہلِ وفا
آستینوں میں مگر کیا ہے دکھاؤ پہلے

جرمِ ناکردہ کا الزام سر آنکھوں پہ مگر
اپنے دامن کے یہ دھبّے تو چھپاؤ پہلے

تم نے سونپے ہیں جنھیں راہبری کے منصب
ان کو چلنے کا سلیقہ تو سکھاؤ پہلے

فکرِ آتش زدگاں تم جو کرو گے معلوم
اپنی دستار تو شعلوں سے بچاؤ پہلے

شہر میں کتنے اکابر ہیں ہمیں کیا معلوم
ہم تو تقدیر پہ شاکر ہیں ہمیں کیا معلوم

یہ تو موصوف بتائیں گے ارادہ کیا ہے
ہم بقول ان کے مہاجر ہیں ہمیں کیا معلوم

ہم تو سمجھے تھے یہاں پائیں گے ہم دادِ سخن
آپ حضرات بھی شاعر ہیں ہمیں کیا معلوم

ڈھونڈھتے پھرتے ہیں ہم شہر میں اخلاص و وفا
اب یہ قدریں بھی نوادر ہیں ہمیں کیا معلوم

ہم کو دھوکا ہوا دستار و قبا سے ان کی
یہ ثقہ لوگ بھی تاجر ہیں ہمیں کیا معلوم

○

پاک دامن کون ہے اور لائقِ تعزیر کون
فیصلہ اس کا کرے گا منصفِ تقصیر کون

کون ہے جو خود نہ ہو آلودۂ تردامنی
حشر میں ہو گا کسی قاتل کا دامن گیر کون

اپنا اپنا تیشہ لے کر اُٹھے ہیں کچھ کوہکن
دیکھنا یہ ہے کہ اب لاتا ہے جُوئے شیر کون

جس سفینے کو ڈبو دیں مِل کے اس کے ناخدا
اس سفینے کی بدل دے دفعتاً تقدیر کون

صرف تاریخِ جنوں دے سکتی ہے اس کا جواب
رقص کرتا ہے پہن کر پاؤں میں زنجیر کون

○

حال مشکوک ہے فضاؤں کا
دَور ہے یہ نئی ہواؤں کا

ہم سے پوچھو قصور کس کا ہے
کچھ عباؤں کا کچھ قباؤں کا

ہم نے گُل کر دئے چراغ اپنے
اب تو بدلے گا رُخ ہواؤں کا

ان سے مت پوچھ ان کے گھر کا پتہ
گھر کہاں ہوتا ہے گداؤں کا

میکدے تک نہیں ہیں اب محفوظ
یہ زمانہ ہے پارساؤں کا

آج شائد مناظرہ ہے کہیں
پیشواؤں سے رہنماؤں کا

ہم ہیں مارے ہوئے وفاؤں کے
نام بدنام ہے جفاؤں کا

بجلیاں بھی انہیں میں پلتی ہیں
کیا بھروسہ ہے ان گھٹاؤں کا

○

دل فگاروں کا ذکر مت چھیڑو
غم کے ماروں کا ذکر مت چھیڑو

مُنہ سے کیا جانے کیا نکل جائے
غم گساروں کا ذکر مت چھیڑو

شہریاروں کو ناگوار نہ ہو
بے دیاروں کا ذکر مت چھیڑو

کیوں ستاتے ہو غم نصیبوں کو
اب بہاروں کا ذکر مت چھیڑو

میں مخاطب ہوں موجِ طوفاں سے
اب کناروں کا ذکر مت چھیڑو

اب تو آنسو بھی میرے پاس نہیں
بے سہاروں کا ذکر مت چھیڑو

چند یادیں ہیں جن سے وابستہ
اُن دیاروں کا ذکر مت چھیڑو

○

کون ہے جس پہ یوں جفا کرتے
ہم نہ ہوتے تو آپ کیا کرتے

اجنبی لوگ اجنبی ماحول
کون سُنتا اگر گلہ کرتے

ہم نے بھی ہونٹ سی لئے اپنے
ایسی صورت میں اور کیا کرتے

ناز ہے مجھ کو دوستوں پہ مگر
شرم آتی ہے التجا کرتے

گفتگو نذرِ احتیاط ہوئی
قبل اس کے کہ ابتدا کرتے

اب بھی ہم سیر چشم ہیں اقبالؔ
آنکھ ہوتی تو جانے کیا کرتے

کوئی اپنا مزاج داں نہ مِلا
عمر گزری یہی دعا کرتے

حادثوں کا کیا ہے وہ آتے رہے جاتے رہے
زندگی کے شوق اپنی بات منواتے رہے

خود فریبی کہیئے اس کو یا ہماری سادگی
ہر غمِ تازہ کی خود توجیہہ فرماتے رہے

عاشقی میں عزّتِ سادات تو بیشک گئی
یہ بھی کیا کم ہے کہ ہم سادات کہلاتے رہے

آپ کی تو اک ادا ٹھہری حجابِ درمیاں
اور کچھ نادان اپنی جان سے جاتے رہے

اس نے رسماً پرسشِ احوال کی زحمت تو کی
رنگ چہرے پر کئی آتے رہے جاتے رہے

○

کون ہے جس کے سبب یہ میکدہ بدنام ہے
ہم سے پوچھو ہم بتا سکتے ہیں کس کا کام ہے

یوں بظاہر تو بہت معصوم صورت ہے مگر
وہ بڑا بہروپیا ہے جس کا ساقی نام ہے

ہم نے بے سمجھے کیا تھا کل جو آغازِ سفر
آج جو کچھ ہے اسی آغاز کا انجام ہے

ہم تو اب صوت و صدا کے شہر میں آباد ہیں
ہم کو اس سے کیا غرض کب صبح ہے، کب شام ہے

آپ جس کو تبصرہ کہتے تھے وہ تنقیص تھی
لہجہ شائستہ سہی، الزام پھر الزام ہے

کون کہتا ہے کہ مخلص دوست اب نایاب ہیں
چند کم ظرفوں کے ہاتھوں دوستی بدنام ہے

اس طرح اکثر غرض مندوں کو مِلتا ہے جواب
میں بہت مصروف ہوں، فرمائیے کچھ کام ہے

○

فقط اک نظر کے سرور سے ترے رند ایسے بہک گئے
کہ لبوں تک آکے بھرے ہوئے کئی جام رات چھلک گئے

مجھے ضبطِ غم پہ غرور تھا، مرے آنسوؤں نے وفا نہ کی
مرے راز، پرسشِ حال پر مری چشمِ نم سے ٹپک گئے

ترے نقشِ پا سے اگر ملی مجھے راہِ شوق میں روشنی
تو مری جبینِ سجود سے ترے نقشِ پا بھی چمک گئے

یہ کدھر سے موجِ ہوا چلی کہ مزاجِ وقت بدل گیا
یہ اِدھر سے کون گذر گیا کہ فضا میں پھول مہک گئے

مجھے چھوڑ دیں کہ سنبھال لیں مری لاج آپ کے ہاتھ ہے
مجھے اعترافِ شکست ہے، مرے پاؤں راہ میں تھک گئے

یہ سفر کا شوق یہ منزلیں تو فقط نصیب کی بات ہے
جو بھٹک رہے تھے پہونچ گئے جو پہونچ چکے تھے بھٹک گئے

مری بزم حسنِ خیال میں وہی میکدہ ہے بسا ہوا
اِدھر آئی یاد وہ زندگی کہ فضا میں جام کھنک گئے

○

رات اک غزل کے شعر بڑا کام کر گئے
محفل میں چند لوگوں کے چہرے اُتر گئے

سچ بات ہم نے جب بھی کہی بے جھجک کہی
چینِ جبیں کو بھی نظر انداز کر گئے

خوابوں کا اک طلسم ہے اور شب گزیدہ لوگ
تعبیر دینے والے نہ جانے کدھر گئے

فکرِ سحر سے تیرہ نصیبوں کو کیا ملا
آنکھیں کُھلیں تو خواب فضا میں بکھر گئے

پتھر جو راستے میں پڑے تھے پڑے رہے
کتنے ہی آنکھوں والے اُدھر سے گزر گئے

جو لوگ نذرِ سیل ہوئے اُن کا غم نہیں
شہروں کے لوگ خوش ہیں کہ دریا اُتر گئے

اقبالؔ اپنے عیب بھی آنے لگے نظر
دشمن ہمارے ہم پہ یہ احسان کر گئے

بکھری پڑی ہے شہر میں خوشبو گلی گلی
گزرا ہے جیسے کوئی اِدھر سے ابھی ابھی

اتنا ہنسے کہ آنکھوں سے آنسو نکل پڑے
ہوتا ہے خود فریبی میں یوں بھی کبھی کبھی

محفل میں دوستوں کی کوئی جا کے کیا کرے
چہرے دُھواں دُھواں ہیں نگاہیں بُجھی بُجھی

کچھ ہو سکونِ قلب مُیسّر تو جانیے
باتیں تو سُنتے آئے ہیں ہم بھی بڑی بڑی

نعرے فلک شگاف ہیں، دعوے بلند بانگ
عنواں جلی جلی ہیں عبارت خفی خفی

نکلے تھے گھر سے جس کے تحفظ کے واسطے
مٹی میں مِل گئی وہ شرافت رہی سہی

اقبالؔ ساری عمر گزاری ہے جس طرح
جو رہ گئی ہے کاٹ دو وہ بھی ہنسی خوشی

گلہ تو آپ سے ہے اور بے سبب بھی نہیں
مگر ارادۂ اظہار زیرِ لب بھی نہیں

میں چاہتا ہوں کہ اپنی زباں سے کچھ نہ کہوں
میں صاف گو ہوں مگر اِتنا بے ادب بھی نہیں

جفا کی طرح مجھے ترکِ دوستی بھی قبول
ملال جب بھی نہ تھا مجھ کو اور اب بھی نہیں

گزر گیا وہ طلب گاریوں کا دَور بہ خیر
خدا کا شکر کہ اب فرصتِ طلب بھی نہیں

مزاجِ وقت سے تنگ آچکا ہے میرا ضمیر
مِرے اصول بدل جائیں تو عجب بھی نہیں

گئے دنوں کا فسانہ ہے اب ہمارا وجود
وہ محفلیں بھی نہیں ہیں وہ روز و شب بھی نہیں

جواب دوں گا میں، کچھ مجھ سے پوچھ کر دیکھو
ابھی میں ہوش میں ہوں، ایسا جاں بلب بھی نہیں

حسب نسب کی جو پوچھو تو شجرہ پیش کروں
خطاب کوئی نہیں ہے مرا، لقب بھی نہیں

بے سبب شکوۂ حالات میں کیا رکھا ہے
ہم نے حالات میں خود زہر مِلا رکھا ہے

غم سے شکوہ ہے مجھے اور نہ وجوہِ غم سے
مجھ کو غم خواروں نے دیوانہ بنا رکھا ہے

اک موہوم سی امید ہے بنیادِ حیات
اک دِیا زد پہ ہواؤں کی جلا رکھا ہے

ان سے کچھ اور چمک جاتی ہے گھر کی ظلمت
اس لئے میں نے چراغوں کو بُجھا رکھا ہے

وہ سُنے گا تو اُسے مُفت ندامت ہوگی
حالِ دِل میں نے اِسی ڈر سے چُھپا رکھا ہے

فکر یہ ہے کہ یہ پھولوں سے بچے گا کیسے
میں نے کانٹوں سے تو دامن کو بچا رکھا ہے

اُس کے وعدہ کا مجھے پاس ہے اُس کو نہ سہی
میں نے راتوں کو بھی دروازہ کھُلا رکھا ہے

اپنے زخموں کی دوا جا کے میں کس سے مانگوں
زہر کا نام بھی دُنیا نے دوا رکھا ہے

منحصر ہے اُسی شکوہ پر رفاقت کا بھرم
ایک شکوہ جو ابھی میں نے اُٹھا رکھا ہے

اب جو مسجد ہے کبھی ایک صنم خانہ تھا
گھر پُرانا ہے مگر نام نیا رکھا ہے

مِرا کلام اُسے کچھ بُرا لگے گا ضرور
مِری کتاب زمانہ مگر پڑھے گا ضرور

سزا کے خوف سے تم چاہے چپ رہو لیکن
جو بات سچ ہے کوئی دِل جلا کہے گا ضرور

جو اہلِ ظرف ہیں شاید زباں سے کچھ نہ کہیں
جو دِل پہ چوٹ لگے گی تو دِل دُکھے گا ضرور

خود اپنے گھر میں ہو کوئی کہ صحنِ گلشن میں
جو حبس ہو گا فضا میں تو دَم گھُٹے گا ضرور

ہَوا چلے نہ چلے، یہ عمل مقدّر ہے
چراغ جو بھی جلے گا کبھی بجھے گا ضرور

مگر یہ بات بھی اپنی جگہ مسلّم ہے
چراغ جب بھی بجھے گا، دھواں اُٹھے گا ضرور

مجھے چراغ حفاظت سے طاق میں رکھ دو
کہ اپنے وقتِ معیّن پہ دن ڈھلے گا ضرور

ہمارے شہر کی روداد چھپ نہیں سکتی
یہ حال کوئی مؤرخ کہیں لکھے گا ضرور

جو بات حق ہے کہے جاؤ مستقل اقبالؔ
تمھاری بات کبھی تو کوئی سُنے گا ضرور

○

آشنا ہوتے ہوئے بھی آشنا کوئی نہیں
جانتے سب ہیں مجھے، پہچانتا کوئی نہیں

ایک تنہا میرے ذمّے کیوں ہے کارِ احتجاج
بولنا سب جانتے ہیں، بولتا کوئی نہیں

مے کشی کی بھی سزا ہے، خودکشی کی بھی سزا
کون کس مشکل میں ہے، یہ دیکھتا کوئی نہیں

مختلف لفظوں میں یہ ہے اب مزاجِ دوستی
رابطہ سب سے ہے، لیکن واسطہ کوئی نہیں

ہم نے خود پیدا کیے ہیں زندگی میں مسئلے
ورنہ سیدھی بات یہ ہے مسئلہ کوئی نہیں

خود کلامی تھی جسے میں گفتگو سمجھا کیا
میں اکیلا تھا، یہاں آیا گیا کوئی نہیں

حسن ہو نامہرباں یا عشق خود بے مہر ہو
ہار دونوں کی ہے اس میں جیتتا کوئی نہیں

ایک پتھر آج میری آنکھ پر آ کر لگا
میں غلط سمجھا، مجھے پہچانتا کوئی نہیں

○

محفل بُجھی بُجھی سی ہے، بے رونقی تو ہے
گِنتی کے کچھ چراغ سہی، روشنی تو ہے

اپنی زباں سے غیر کو بھی کیوں بُرا کہو
دشمن سہی، تعلقِ ہمسایگی تو ہے

آوارہ گردِ شہر کو پتھر نہ مارنا
آداب آشنا نہ سہی، آدمی تو ہے

بھر جائے گا یہ زخم بھی، کیوں فکرمند ہو
گہرا تو ہے ضرور مگر زخم ہی تو ہے

مشکل کُشا مُصر ہے کہ ہم التجا کریں
اور التجا گدائی ہے، مشکل یہی تو ہے

خدشہ فقط نوشتۂ تقدیر سے نہیں
اندیشۂ نوشتۂ دیوار بھی تو ہے

بیٹھے تو ہیں سکون سے اپنے گھروں میں لوگ
تاریک و تنگ ہی سہی، اپنی گلی تو ہے

اقبالؔ پھر سُنا ہے کہ آنے کو ہے بہار
یہ بات ہم نے پہلے بھی اکثر سُنی تو ہے

اور تیزی سے کنارے آ لگی کشتی مِری
موجِ طوفاں بھی کبھی کرتی ہے کارِ ناخدا

کل کہیں تھے، اب کہیں ہیں اور سفر میں ہیں ہنوز
ہم مُسافر کیا بتادیں مُستقل اپنا پتہ

عشق ہوتا ہے مزاجاً انتہائی زود رنج
ہر ذرا سی بات بن جاتی ہے نازک مسئلہ

○

مختصر ہو کس طرح یہ نفسیاتی فاصلہ
اک طرف پندارِ ثروت، اک طرف مفلس انا

آپ نے جو کچھ کہا، فرمایئے کس نے سُنا؟
ایسی محفل میں بیانِ حالِ دِل سے فائدہ؟

کوئی قصداً غرق ہو جائے تو اِس کا کیا علاج
اس کو سب الزام دیں گے، کیا خدا، کیا ناخدا

دیکھنے کی بات یہ ہے دینے والا کون ہے
ورنہ جو کشکولِ سائل ہے، وہی دستِ دعا

زندگی پر اس سے بہتر تبصرہ ممکن نہیں
ٹھیک دریا کے کنارے ہے زمینِ کربلا

منصب تو ہمیں بھی مِل سکتے تھے لیکن شرطِ حضوری تھی
یہ شرط ہمیں منظور نہ تھی، بس اتنی سی مجبوری تھی

کہتے ہیں کہیں اک نگری تھی، سُلطان جہاں کل جابر تھا
اور جبر کا اذنِ عام بھی تھا، یہ رسم وہاں جمہوری تھی

کچھ درد سا ہے تو پہلو میں، پہلے سے لیکن ہلکا ہے
یا دستِ جفا کچھ نازک تھا یا شاید ضرب ادھوری تھی

نظریں بھی ملیں، کچھ لب بھی ہلے، ماتھے پہ شکن بھی اک اُبھری
گو مُنہ سے اُس نے بات نہیں کی، بات تو لیکن پُوری تھی

یہ بات ہے برسوں پہلے کی جب ہم بھی عینی شاہد تھے
اک دورِ بہاراں آیا تھا لیکن وہ بہار اُدھوری تھی

ہم ٹھوکر کھا کر جب بھی گرے، رہ گیروں کو آواز نہ دی
وہ آنکھوں کی معذوری تھی، یہ غیرت کی مجبوری تھی

لہجے میں انا، ماتھے پہ شکن، اس وقت کا عین تقاضا ہے
اب ہر وہ بات ضروری ہے جو پہلے غیر ضروری تھی

ہم اہلِ سخن کی قیمت ہے اقبالؔ زبانی داد و دہش
کل محفل میں جو ہم کو ملی، وہ داد نہ تھی، مزدوری تھی

فکریں فقط تمھیں کو نہیں ہیں، ہمیں بھی ہیں
ہنس بول تو رہے ہیں، پریشان تو نہیں

گھر کے چراغ بجھ گئے، گھر تو نہیں گرا
جھونکا ہوا کا ہے، کوئی طوفان تو نہیں

سالم ہے اب بھی میرے گریباں کا تار تار
یہ قیس و کوہکن کا گریبان تو نہیں

وہ خوش نصیب تھے جو سلامت گزر گئے
راہِ وفا مگر کوئی آسان تو نہیں

جاری ہے اب بھی سلسلۂ پرسش و سلام
پہلے سے ربط و ضبط کا امکان تو نہیں

اب نقدِ جاں بھی پیش کریں گے حضورِ دوست
ہم اب بھی ایسے بے سروساماں تو نہیں

اک دوست نے بُلایا ہے، ہم کیسے ٹال دیں
یہ کوئی قصرِ شاہی کا فرمان تو نہیں

اقبالؔ پھر بھی ساتھ تو دیتا ہے وقت کا
مانا کہ دِل میں اب کوئی ارمان تو نہیں

دِل کی بربادی میں شامل تھی رضا آنکھوں کی
اس کی پاداش میں کام آئی ضیاءِ آنکھوں کی

آنکھ ماحول سے جب ترکِ تعلق کر لے
غور کیجے تو وہ ہوتی ہے اَنا آنکھوں کی

زیرِ لب موجِ تبسّم نہ عروسانہ لباس
حُسنِ معصوم کی پہچان حیا آنکھوں کی

حالِ دِل لفظوں کا محتاج ہے یہ کس نے کہا
کوئی سمجھے تو یہ آنسو ہیں صدا آنکھوں کی

ہم کو لے ڈوبے گا یہ ظاہر و باطن کا تضاد
رُوح کا کرب جُدا، راہ جُدا آنکھوں کی

گوہرِ اشک کو ارزاں نہیں کرتے یہ لوگ
قدر پہچانتے ہیں اہلِ وفا آنکھوں کی

آنکھ والوں نے اُڑایا ہے اندھیروں کا مذاق
روشنی چھین نہ لے اُن سے خدا آنکھوں کی

خوش نگاہی کی تو کچھ اور سزا ہوتی ہے
بے نگاہی تو بہت کم ہے سزا آنکھوں کی

اس کو کیا کہتے ہیں اقبالؔ میں کس سے پُوچھوں
حُسن خود دادطلب اور خطا آنکھوں کی

○

یہ خلوص کوئی خلوص ہے کہ دِلوں میں ربطِ بہم نہیں
تمھیں اعترافِ ستم نہیں، مجھے اعتبارِ کرم نہیں

یہ سُنا تھا عشق کو آنسوؤں سے بہت قریب کا ربط ہے
تو یہ میرے عشق کو کیا ہُوا، ابھی میری آنکھ تو نم نہیں

مجھے زہرِ عشق قبول ہے جو مِری وفا کا زیاں نہ ہو
مجھے اپنی آن عزیز ہے، مِری جان اِتنی اہم نہیں

وہ خوشی بھی کوئی خوشی ہوئی جو رہینِ دستِ سوال ہو
یہ تو زندگی کا مزاج ہے، مجھے غم کا کوئی بھی غم نہیں

یہ فقط غرور کی بات ہے کہ زباں سے اپنی نہ تم کہو
تمھیں ورنہ اِس کی خلش تو ہے کہ تمھاری بزم میں ہم نہیں

جو سلوک از رہِ رسم ہو، وہ تمام عمر بھی ہو تو کیا
جو خلوصِ قلب کے ساتھ ہو تو وہ اک نگاہ بھی کم نہیں

مِری آنکھ بجھ بھی گئی تو کیا، مِری روشنی مِرے ساتھ ہے
ابھی میرا چاند چھپا نہیں، مِرے گھر میں شامِ الم نہیں

مِری بات ہوتی ہے دُو بدُو، میں خطاب کرتا ہوں رُو برُو
مِرے سامعین کی خیر ہو، مجھے احتیاجِ قلم نہیں

یہ جو شکوے تم کو وطن سے ہیں وہ بجا سہی مِرے دوستو!
مگر ایک بات نہ بھُولنا، یہ تمھارا گھر ہے، اِرم نہیں

○

اپنے ماضی سے جو ورثے میں مِلے ہیں ہم کو
ان اصولوں کی تجارت نہیں ہوگی ہم سے

عہدِ حاضر کی ہر اک بات ہمیں دِل سے قبول
صرف توہینِ روایت نہیں ہوگی ہم سے

جھوٹ بھی بولیں، صداقت کے پیمبر بھی بنیں
ہم کو بخشو، یہ سیاست نہیں ہوگی ہم سے

زخم بھی کھائیں، رقیبوں کو دُعائیں بھی دیں
اتنی مخدوش شرافت نہیں ہوگی ہم سے

سُرخ پتھر کے صنم ہوں کہ وہ مرمر کے صنم
بُت کدوں میں تو عبادت نہیں ہوگی ہم سے

ہے اطاعت کے لئے اپنا فقط ایک خدا
ناخداؤں کی اطاعت نہیں ہوگی ہم سے

غیر مشروط رفاقت کے طرف دار ہیں ہم
شرط کے ساتھ رفاقت نہیں ہوگی ہم سے

فکر و اظہار میں ہم حکم کے پابند نہیں
شاعری حسبِ ہدایت نہیں ہوگی ہم سے

صرف یہ باتیں اگر آپ گوارا کرلیں
آپ کو کوئی شکایت نہیں ہوگی ہم سے

○

وہ خوش فہمی جو منزل آشنا ہونے سے پہلے تھی
ہمیں بھی تھی مگر کچھ تجربہ ہونے سے پہلے تھی

وہ اب ہوتی تو کتنی کام آتی سارے گلشن کے
جو بے تابی اسیروں میں رِہا ہونے سے پہلے تھی

کئی وعدے کئے تھے اُس نے مجھ سے صدقِ نیّت سے
یہ ساری گفتگو لیکن جُدا ہونے سے پہلے تھی

نگاہِ حُسن میں بھی قدر تھی میری محبت کی
مگر یہ قدر عرضِ مُدعا ہونے سے پہلے تھی

تلافی کر گئی اُس کے سلوکِ بے نیازی کی
وہ اک موجِ تبسّم جو خفا ہونے سے پہلے تھی

اُسی کا نام ہے شاید متاعِ آرزومندی
جو لذّت زخمِ دل کے لادوا ہونے سے پہلے تھی

ہمیں عادت نہ اب ہے اور نہ تھی فریاد کرنے کی
کبھی تھی بھی تو احساسِ انا ہونے سے پہلے تھی

کبھی حق گوئی پر بھی مصلحت گوئی کا پہرہ تھا
مگر یہ رسم میرے لب کُشا ہونے سے پہلے تھی

کوئی وعدہ کرے گا اور قصداً بھول جائے گا
ہمیں اس کی خبر عہدِ وفا ہونے سے پہلے تھی

مصائب جھیل کر اقبالؔ ہم کو ہوش آیا ہے
مگر اس کی ضرورت حادثہ ہونے سے پہلے تھی

○

حیرت ہے کہ طوفان سے ہم کیسے گزر آئے
شاید ابھی دنیا کو ضرورت ہے ہماری

ناموسِ روایت بھی، سیادت بھی، انا بھی
صد شکر کہ ہر چیز سلامت ہے ہماری

دشمن بھی جو سچ پُوچھو تو مُحسن ہیں ہمارے
ان سب کی بدولت ہی تو عزّت ہے ہماری

پُرسِش سرِ بازار، شکایت سرِ محفل
اب آپ کے نزدیک یہ قیمت ہے ہماری

ہر آنکھ سے ٹپکا ہُوا آنسو ہے ہمارا
دُکھ چاہے کسی کا ہو امانت ہے ہماری

ہم لوگ تو دشمن سے بھی کینہ نہیں رکھتے
جب چاہو چلے آؤ، اجازت ہے ہماری

بولیں تو خطاوار، نہ بولیں تو خطاوار
ہر حال میں اقبالؔ مصیبت ہے ہماری

○

اب تو مفہوم ہی کچھ اور ہے سچائی کا
مصلحت طور بدل دیتی ہے گویائی کا

دوست دشمن کی بھی پہچان نہیں ہے جن کو
ان غریبوں پہ بھی الزام ہے بینائی کا

آپ کے سامنے بیمار نے دَم توڑا ہے
اب کبھی نام نہ لیجے گا مسیحائی کا

میں نے یہ سوچ کے شہرت کا تعاقب نہ کیا
اس میں کچھ اور بھی اندیشہ ہے رسوائی کا

کنجِ تنہائی تو کچھ ایسی بُری چیز نہیں
ہے بُری چیز تو احساس ہے تنہائی کا

میرا دل رکھنے کی خاطر ہے اگر یہ وعدہ
شکریہ آپ کی اس حوصلہ افزائی کا

اتنے گہرے ہیں ابھی زخم شناسائی کے
نام لیتے ہوئے ڈرتا ہوں شناسائی کا

اور کب تک یونہی ارزانیٔ ناموس و ضمیر
فائدہ کیا ہوا اب تک کی جبیں سائی کا

○

جب ان سے ملے تب صبر آیا، جو خود بھی لُٹ کر آئے تھے
پہلے پہل اِس شہر میں ورنہ ہم تو بہت گھبرائے تھے

احباب، مریضِ غم کے لئے کچھ چارہ گروں کو لائے تھے
پھر کیا جانے کیوں لوٹ گئے، دروازے تک تو آئے تھے

جب گھر کی آگ بجھی تو کچھ سامان بچا تھا جلنے سے
سو وہ بھی اُن کے ہاتھ لگا جو آگ بجھانے آئے تھے

جو لوگ شریکِ سازش تھے، ہم نام بھی اُن کا کیسے لیں
کچھ اُن میں دوست پرانے تھے، کچھ باعزّت ہمسائے تھے

کچھ اہلِ خرد اب کہتے ہیں، اِس حال سے ماضی اچھا تھا
اور یہی جب ہم نے کہا تھا، دیوانے کہلائے تھے

بے چارے چارہ سازوں کو، ناکامی کا الزام نہ دو
وہ ان زخموں کا کیا کرتے جو جان کے ہم نے کھائے تھے

اِس شوقِ غزل گوئی سے، اُن کی حُرمت بھی مجروح ہوئی
جو زخم بڑی مشکل سے ہم نے ساری عمر چُھپائے تھے

○

شکوہ بھی جفا کا کیسے کریں، اک نازک سی دُشواری ہے
آغازِ وفا خود ہم نے کیا تھا، پہلی بھول ہماری ہے

دُکھ تم کو جب جب پہنچا ہے خود ہم نے آنسو پونچھے ہیں
اب دِل پہ ہمارے چوٹ لگی ہے، اب کے تمھاری باری ہے

بے کھیلے بازی جیت کے بھی تم ہم سے شاکی رہتے ہو
اور ہم کو دیکھو ہم نے تو خود جان کے بازی ہاری ہے

وہ عہد تھا عیش و جوانی کا، اب عُمر ہے سعیِ تلافی کی
پہلے بھی نیند پرائی تھی اور اب بھی شب بیداری ہے

کچھ دردِ نہاں، کچھ فکرِ جہاں، کچھ شرمِ خطا، کچھ خوفِ سزا
اِک بوجھ اُٹھائے پھرتا ہوں اور بوجھ بھی کتنا بھاری ہے

جو کاری زخم لگا ہے دِل پر، پہلے اس کی فکر کرو
یہ بعد میں دیکھا جائے گا، یہ کس کی کارگزاری ہے

جو صاحب گھر گھر میری بابت زہر اُگلتے پھرتے ہیں
وہ صرف مِرے ہمسائے نہیں ہیں، اُن سے قرابت داری ہے

اس راہ سے ہو کر گزرے ہیں کچھ رہبر بھی، کچھ رہزن بھی
اب نقشِ قدم پہچان کے چلنا آپ کی ذمّہ داری ہے

○

اپنے مرکز سے اگر اور نکل جاؤ گے
خواب ہو جاؤ گے، افسانوں میں ڈھل جاؤ گے

اب تو چہروں کے خد و خال بھی پہلے سے نہیں
کس کو معلوم تھا تم اتنے بدل جاؤ گے

اپنے پرچم کا کہیں رنگ بھلا مت دینا
سُرخ شعلوں سے جو کھیلو گے تو جل جاؤ گے

دے رہے ہیں تمھیں تو لوگ رفاقت کا فریب
ان کی تاریخ پڑھو گے تو دہل جاؤ گے

اپنی مٹّی ہی پہ چلنے کا سلیقہ سیکھو
سنگِ مرمر پہ چلو گے تو پھسل جاؤ گے

خوابگاہوں سے نکلتے ہوئے ڈرتے کیوں ہو
دھوپ اتنی تو نہیں ہے کہ پگھل جاؤ گے

تیز قدموں سے چلو اور تصادم سے بچو
بھیڑ میں سست چلو گے تو کچل جاؤ گے

ہمسفر ڈھونڈھو، نہ رہبر کا سہارا چاہو
ٹھوکریں کھاؤ گے تو خود ہی سنبھل جاؤ گے

تم ہو اک زندۂ جاوید روایت کے چراغ
تم کوئی شام کا سورج ہو کہ ڈھل جاؤ گے

صبحِ صادق مجھے مطلوب ہے کس سے مانگوں
تم تو بھولے ہو چراغوں سے بہل جاؤ گے

نقش ماضی کے جو باقی ہیں مٹا مت دینا
یہ بزرگوں کی امانت ہے گنوا مت دینا

وہ جو رزاق حقیقی ہے اسی سے مانگو
رزق برحق ہے کہیں اور صدا مت دینا

بھیک مانگو بھی تو بچوں سے چھپا کر مانگو
تم بھکاری ہو کہیں ان کو بتا مت دینا

صبحِ صادق میں بہت دیر نہیں ہے لیکن
ابھی عجلت میں چراغوں کو بجھا مت دینا

اپنے مشکوک ارادوں کی زیاں کاری پر
اپنی تقدیر کو الزامِ خطا مت دینا

تم کو ورثے میں ملی ہے یہ بڑوں کی سوغات
رنگ خانوں میں یہ شمشیر چھپا مت دینا

پیروی چاہتا ہے جادۂ قرآن و حدیث
ان صحیفوں کو فقط گھر میں سجا مت دینا

غیر مشروط رفاقت ہی کا سودا کرنا
شرط کے ساتھ رفاقت پہ رضا مت دینا

میں نے جو کچھ بھی کہا صرف محبت میں کہا
مجھ کو اِس جُرمِ محبت کی سزا مت دینا

راہ میں جو بھی رُکاوٹ ہو ہٹا دینا ہے
لاکھ اونچی سہی، دیوار گرا دینا ہے

ہم پہ اس عہد کا جو قرض چلا آتا ہے
اب کے جیسے بھی ہو وہ قرض چکا دینا ہے

اپنی غیرت پہ بہت ظلم کیے ہیں ہم نے
خود کو اب اپنے ہی ہاتھوں سے سزا دینا ہے

تاکہ پسپائی کا امکان ہی باقی نہ رہے
ایک بار اور سفینوں کو جلا دینا ہے

ہم ابھی چُپ ہیں مگر روزِ حساب آنے دو
ہم کو معلوم ہے کیا لیتا ہے، کیا دیتا ہے

بادِ صرصر سے کوئی اور توقع بے سوٗد
اس کی فطرت تو چراغوں کو بُجھا دینا ہے

اب توقّف کی ضرورت ہے، نہ خوش فہمی کی
فتنۂ جبر کو بروقت دبا دینا ہے

ہم نے سیکھا ہے اذانِ سحری سے یہ اصول
لوگ خوابیدہ سہی، ہم کو صدا دینا ہے

ہم کو حالات نے مجبور کیا ہے ورنہ
ہم فقیروں کا تو معمول دُعا دینا ہے

○

جب آدمی کا طرزِ سخن معتبر نہ ہو
زیبِ سخن حوالۂ قرآں ہُوا تو کیا

زنجیرِ پا تو اپنی جگہ برقرار ہے
زندانیوں پہ وا درِ زنداں ہُوا تو کیا

ظلمت کدے دِلوں کے منوّر نہ ہوسکے
بالاہتمام جشنِ چراغاں ہُوا تو کیا

غنچے کھِلے کہیں نہ نسیمِ سحر چلی
صحنِ چمن میں شغلِ بہاراں ہُوا تو کیا

اہلِ جنوں بچا نہ سکے عصمتِ چمن
اس جستجو میں چاک گریباں ہُوا تو کیا

اعلانِ آفتابِ فروزاں ہُوا تو کیا
ایوانِ خاص صرف درخشاں ہُوا تو کیا

جو اس کے دِل میں حشر بپا ہے، نہ پُوچھیے
اقبالؔ بے دِلی سے غزل خواں ہُوا تو کیا

○

اپنے لئے کچھ اور ہے عنوانِ تشفّی
یہ سعیٔ تبسّم تو زمانے کے لئے ہے

جو اصلِ حقیقت ہے ہمیں بھی نہیں معلوم
احوال تو دُنیا کو سُنانے کے لئے ہے

ماحول کی افسردہ دلی غور طلب ہے
یہ رونقِ محفل تو دکھانے کے لئے ہے

کچھ اور ہیں دیرینہ رفاقت کے تقاضے
پرسش تو فقط رسم نبھانے کے لئے ہے

○

زخمِ دِل سارے زمانے کو دِکھانے سے رہے
آبرو ہم سرِ بازار لُٹانے سے رہے

غم ہمارا جو کسی نے نہیں سمجھا نہ سہی
آہ کرنے سے رہے، اشک بہانے سے رہے

تم نے پُرسش تو بڑے پیار سے کی ہے لیکن
حالِ دل ہم سرِ محفل تو سُنانے سے رہے

کیا کریں آپ سے مِلنے کی یہی صورت ہے
ورنہ ہم محفلِ اغیار میں جانے سے رہے

شکوہ کرنا ہمیں آتا نہ ہو ایسا تو نہیں
اپنے یاروں کا مگر دل تو دُکھانے سے رہے

وہ بُرا ہے کہ بھلا ہے، وہی پیارا ہے ہمیں
اب کوئی اور نیا دوست بنانے سے رہے

گاہِ گاہِ کوئی رُوٹھے تو سر آنکھوں پہ مگر
روز روٹھے کوئی تو روز منانے سے رہے

جہاں کچھ ثقہ لوگ داخل ہوئے تھے وہاں باوضو ہم بھی پہنچے تھے لیکن
جو دیکھا تو کچھ اور ہی ماجرا تھا، وہ مسجد نہیں تھی کوئی بُت کدہ تھا

جو تنقیدِ ناحق پہ وہ کچھ نہ بولا، تو اقبالؔ کو بے زباں تم نے جانا
جو سمجھو تو وہ بے زبانی نہیں تھی، وہ محفل پہ بھرپور اک تبصرہ تھا

ہم نگری نگری جاتے ہیں اور گھر گھر گیت سناتے ہیں
ہم گلیوں گلیوں، آنگن آنگن پیار کے دیپ جلاتے ہیں

ہم خوشبو کے سوداگر ہیں اور سودا سچّا کرتے ہیں
جو گاہک پھولوں جیسا ہو، ہم بِن داموں بِک جاتے ہیں

ہم شہرِ وفا کے لوگوں کا تم حال بھلا کیا جانو گے
ہم دِل کی چوٹ چھپاتے ہیں اور آنسو تک پی جاتے ہیں

جو لوگ شرافت والے ہیں، وہ قدرے بُزدل ہوتے ہیں
دُشمن سے نہیں ڈرتے وہ مگر کم ظرفوں سے گھبراتے ہیں

احساسِ حمیّت اہلِ نسب کی سب سے بڑی کمزوری ہے
وہ اپنوں سے بھی حالِ پریشاں کہتے ہوئے شرماتے ہیں

ہم سچے ہیں یہ کیسے کہیں، سچ سب کے بس کی بات نہیں
جو سچی باتیں کرتے تھے وہ پیغمبر کہلاتے ہیں

اقبالؔ تو ادنیٰ خادم ہے اربابِ علم و دانش کا
یہ آپ کا حسنِ سماعت ہے جو اس پہ کرم فرماتے ہیں

○

نظامِ مصطفیٰؐ کی بات تو کرتے ہو تم لیکن
طرب خانے کہاں جائیں گے، کاشانوں کا کیا ہو گا؟

اساسِ زندگی ٹھہرا اگر دستورِ قرآنی
تو پیمانے کہاں رکھّو گے، مے خانوں کا کیا ہو گا؟

اذاں گونجے گی ہر گوشے سے جب لحنِ بلالی میں
تو یہ سوچو کہ پوشیدہ صنم خانوں کا کیا ہو گا؟

اگر طاقِ حرم سے روشنی اس سمت آ پہنچی
تو شمعِ ساقیٔ محفل کے پروانوں کا کیا ہو گا؟

اُتاری جائے گی نانِ جویں جب حلق نازک میں
تو ظہرانوں کا، عصرانوں کا، مہمانوں کا کیا ہو گا؟

بچھے گا بوریا جب خواب گاہِ اہلِ عشرت میں
تو ان آراستہ شاہی شبستانوں کا کیا ہوگا؟

نقابیں چھین لی جائیں گی جب مکروہ چہروں سے
مُلمّع کیا کرے گا، آئینہ خانوں کا کیا ہوگا؟

اگر پردہ نشیں ہو جائے لیلیٰ عصرِ حاضر کی
تو ان آوارۂ بازار دیوانوں کا کیا ہوگا؟

اگر اِس بار بھی وعدے غلط نِکلے اکابر کے
تو غم خوارانِ ملّت کے گریبانوں کا کیا ہوگا؟

قطعات

جو تیرہ۔بخت اُجالوں سے خوف کھاتے ہیں
وہ کانپ جاتے ہیں جب بھی کہیں چراغ جلے
وہ جانتے ہیں کہ ظلمت ہے مجرموں کی رفیق
جو اُن کا زور چلے تو کبھی نہ رات ڈھلے

شام کو جب چراغ جلتے ہیں
سائے قدموں کے ساتھ چلتے ہیں
یہ کہیں اور سے نہیں آتے
سائے خود روشنی میں پلتے ہیں

ایک پروانہ۔جو جل۔بُجھتا ہے نادانستہ
لوگ کہتے ہیں کہ وہ شمع کا پروانہ ہے
عشق کچھ کھیل نہیں ہے جو پتنگے کھیلیں
یہ فقط کہنے کی اک بات ہے، افسانہ ہے

تم فقط میکدوں کو کہتے ہو
جھانک کر دیکھو خانقاہوں میں

کچھ سمجھ کر ہی کیا تھا اس نے شہروں سے فرار
ہم ہی دیوانے ہیں شاید، قیس سودائی نہ تھا

میرے آنسو بھی بے اثر نکلے
اک سہارا تھا وہ بھی ٹوٹ گیا

ظلمتِ شام سے اندازۂ انجام نہ کر
رات کی رات میں انجام بدل سکتا ہے

صبح کی پہلی کرن لائے گی پیغامِ حیات
اسی زنداں میں ہے اک روزنِ زنداں ابھی

آئینہ سچ بولتا ہے، بے جھجک اور روبرو
ہو نہ چہرے پر اگر کوئی ملمع یا نقاب

تم اہلِ قلم کی فکر کرو، ہم اہلِ زباں سے مت اُلجھو
ہم لکھتے نہیں ہم کہتے ہیں، تم ہم سے قلم کیا چھینو گے

قطعات

یہ آنسو ہمارا لہجہ ہیں اور آنکھیں باتیں کرتی ہیں
تم ہونٹ ہمارے سی سکتے ہو، دیدۂ نم کیا چھینو گے

تم اہلِ قلم کی فکر کرو، ہم اہلِ زباں سے مت اُلجھو
ہم لکھتے نہیں ہم کہتے ہیں، تم ہم سے قلم کیا چھینو گے

قفس سے چھوٹ کے پچھتائے بندگانِ قفس
چمن کے شوق میں نادان بال و پَر سے گئے

تمھارا شہر تو آباد ہو گیا لیکن
تمھارے شہر کی خاطر ہم اپنے گھر سے گئے

آدمی اندر سے چاہے ٹوٹ جائے
کم سے کم لہجہ توانا چاہیے

غم غلط کرنا کوئی مشکل نہیں
انتقاماً مسکرانا چاہیے

ضبط بھی جزوِ شجاعت ہے مگر
ایک حد تک ظلم سہنا چاہیے

ہونٹ سی لوگے تو دَم گھُٹ جائے گا
بات سچّی ہو تو کہنا چاہیے

قاضیٔ شہر کے حضور نہ جاؤ
اور نہ پیر و فقیر سے پوچھو

مستحق تم سزا کے ہو کہ نہیں
اپنے اپنے ضمیر سے پوچھو

راضی بہ رضا ہوتے ہیں اربابِ قناعت
وہ اپنا بھرم دستِ طلب سے نہیں کھوتے

دامانِ توکل کی یہ خوبی ہے کہ اس میں
پیوند تو ہو سکتے ہیں، دھبّے نہیں ہوتے

ہم پہ کیا گزری ہے ماضی میں یہی مت پوچھو
کچھ مناسب نہیں وہ حال مُفصّل کہنا

خون جس شہر میں پندارِ تمنّا کا ہُوا
ہم کو اچھا نہیں لگتا اسے مقتل کہنا

مقسوم ہمارے گُلشن کا جو پہلے تھا وہ اب بھی ہے
ہر موسم میں گو زینت کی تدبیر بدل دی جاتی ہے

مدّت سے چلا آتا ہے یہی دستور ہمارے زنداں کا
جب شور مچاتے ہیں قیدی زنجیر بدل دی جاتی ہے

متفرّق اشعار

اسی کا نام ہے شاید تعلقِ خاطر
وہ سوچتا ہے تو مجھ کو سنائی دیتا ہے

مِرے مزاج کا اِس میں کوئی قصور نہیں
ترے سلوک نے لہجہ بدل دیا میرا

آپس میں تاکہ صورتِ رنجش نہ پیش آئے
اب کے سفر کریں گے کسی اجنبی کے ساتھ

سُنا ہے میرے رقیبوں میں سخت اَن بَن ہے
مِرے خلاف مگر اتحاد ہے ان میں

اپنی حدوں میں تھا تو سمندر عمیق تھا
سیلاب بن کے پھیلا تو پایاب ہو گیا

۲۲

اُتر کر قصرِ عالی سے ہمارے رُوبرُو آؤ
بلندی سے ہمارے قد کا اندازہ نہیں ہوگا

○

ہماری تلخ نوائی تمھیں بُری تو لگی
تمھارا لہجہ بھی کچھ ہم سے مختلف تو نہ تھا

○

آپ کے لہجے میں پندار کی بُو آتی ہے
سرپرستوں کی طرح حال نہ پُوچھا کیجے

جو ہم نے دیکھا ہے آنکھوں سے کیا بتائیں تمھیں
جو تم بھی ہوتے تو آنکھوں پہ ہاتھ رکھ لیتے

سچی بات چھپا لینا تو کچھ ایسا دشوار نہیں
جھوٹ اک ایسی سچائی ہے جس کا چھپانا مشکل ہے

تسلیم کہ اک شمع کی ضو کم ہے، بہت کم
اک شمع بھی ظلمات میں جلتی ہے یہ مشکل

○

ہم ماتھے پہ بل ڈال کے بازار سے گزرے
ہم جیسے فقیروں کو کوئی دے بھی تو کیا دے

○

تلخیٔ دوراں اپنی جگہ ہے، سعیٔ تبسّم اپنی جگہ
آپ کا آخر کیا منشا ہے، جیتے جی مر جائیں کیا؟

جواب دوں گا تمھارے ہر اک سوال کا میں
نظر نظر سے مِلا کر مگر سوال کرو

ہر سانس پہ ہے منزلِ آخر قریب تر
جو لوگ اپنے گھر میں ہیں وہ بھی سفر میں ہیں

میرا بھی اک دوست تھا یوسف نہایت خوش جمال
اور خوش قسمت بھی تھا، اس کا کوئی بھائی نہ تھا

کہاں سے سیکھ لی تم نے بھی یہ اداکاری
تمھاری آنکھوں میں آنسو عجیب لگتے ہیں

چراغِ آخرِ شب ہے ہواؤں کی زد میں
نجانے کون سا جھونکا اِسے بجھا جائے

وہ اپنی بزم میں مجھ کو بُلا کے پچھتایا
وہ چاہتا تھا کہ میں سر جھکا کے بیٹھوں گا

پتھر جو راستے میں پڑے تھے پڑے رہے
کتنے ہی آنکھوں والے ادھر سے گزر گئے

سوال کر کے وہ تا دیر کچھ خجل سا رہا
جواب دے کے اسے لاجواب کیا کرتا

بجھا لو اپنی آنکھیں جس طرح ہم نے بجھالی ہیں
نہ خوفِ تیرگی ہوگا نہ فکرِ روشنی ہوگی

یہ چہرے کے داغوں کو چھپا تو نہیں سکتا
یہ آئینہ ہے کوئی مصوّر تو نہیں ہے

ہر دور میں جشنِ رسن و دار ہوا ہے
اور جب بھی ہوا ہے سرِ بازار ہوا ہے

مبادا مہرِ خاموشی لگا دی جائے ہونٹوں پر
غزل کو احتیاطاً ہم نے گویائی سِکھا دی ہے

○

بہت عمیق سہی اور بے کنار سہی
کسی کی پیاس سمندر بُجھا نہیں سکتا

○

مجھے ملال نہیں اپنی بے نگاہی کا
جو دیدہ ور ہیں انھیں بھی نظر نہیں آتا

○

اب اس کے ظلم کا شکوہ بھی کس زباں سے کریں
کہ انتخاب تو ظالم کا خود ہمیں نے کیا

جب گھر کی آگ بُجھی تو کچھ سامان بچا تھا جلنے سے
سو وہ بھی ان کے ہاتھ لگا جو آگ بُجھانے آئے تھے

جُھک کر سلام کرنے میں کیا ہرج ہے مگر
سر اتنا مت جُھکاؤ کہ دستار گر پڑے

○

منزل وہی ہے، راہ وہی، راہرو وہی
ہاں یہ ضرور ہے کہ ارادے بدل گئے

○

کچھ سمجھ کر ہی کیا تھا اس نے شہروں سے فرار
ہم ہی دیوانے ہیں شاید، قیس سودائی نہ تھا

Cont by the